درد

سات ناولوں کا مجموعہ

نبیلہ ابر راجہ

درد

درد

نبیلہ ابر راجا

"تیرے سنگ دوستی
ہم نہ توڑیں کبھی
سنگ اپنا رہے نہ رہے"
تحریم کچن سمیٹتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ زویا کو فرینڈ شپ ڈے کے لیے سونگ کی تیاری کرواتے کرواتے وہ وقت بے وقت تیرے سنگ دوستی گنگنانے لگتی۔ آدھے گھنٹے سے کچن میں مصروف عمل اس نے یہ شغل جاری رکھا ہوا تھا۔ آہٹ پر بے اختیار

اس کے لب ساکت ہوگئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اشعر زویا کو اٹھائے کھڑا بڑی بھرپور اور جائزہ لیتی نگاہوں سے اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔ اس شغل میں اس کی لاڈلی زویا بھی شامل تھی۔ جو اپنی ذہانت سے بھرپور نگاہیں تحریم پر جمائے ہوئے تھی۔

''کیا خیال ہے بیٹا جانی، آپ کے فرینڈ شپ ڈے پہ آپ کی مما کو ہی نہ بھجوادیں؟'' اشعر شرارتیں دل میں دبائے زویا سے پوچھ رہا تھا۔

''آف کورس پپا، مما اتنا اچھا گاتی ہیں...... مجھے مما نے تیری میری ایسی دوستی بھی یاد کروایا ہے۔ میری ٹیچرز کہتی ہیں آپ کی پریکٹس ہی اتنی اچھی ہے تو پرفارمنس کیسی ہوگی......'' زویا نے تائید کے ساتھ باقی کہانی بھی سنادی۔

تحریم دونوں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ دھلے برتن خشک کر کے اس نے اپنی جگہ پہ رکھے اور قدم آگے بڑھائے۔ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ جب سے گھر میں زویا کے اسکول میں ہونے والے فرینڈ شپ ڈے کا ذکر چھڑا تھا اور تحریم نے اسے تیاری کروانی شروع کی تھی تب سے اشعر اس کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔ یہ اس کی دکھتی رگ تھی۔ کیونکہ کالج لائف میں تحریم کو گلوکاری کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کالج میں ہونے والے فنکشنز میں وقتاً فوقتاً اپنے اس شوق کا اظہار بھی کرتی پر برا ہو اس وقت کا جب اس نے احمد سیال سے کہا کہ میں باقاعدہ گلوکاری کی تربیت لینا چاہتی ہوں۔

احمد سیال کا خاندانی جاہ وجلال اس قسم کے شوق کی آبیاری پر آمادہ نہیں تھا۔ تحریم کے کالج جانے پر پابندی لگ گئی کہ یہ الٹے سیدھے کام وہ کالج سے ہی سیکھتی ہے۔ بڑے رونے دھونے کے بعد اور وعدوں کے بعد اسے دوبارہ کالج جانے کی اجازت ملی۔ یونیورسٹی پہنچنے کے بعد اس کا یہ شوق پھر سے تازہ ہوگیا جہاں ایسی سرگرمیوں کے مواقع وافر مقدار میں دستیاب تھے۔ ایسے ہی ایک فنکشن میں اشعر نے اسے پہلی بار گاتے سنا اور اس کے منہ پہ کہہ دیا آپ اونچے سُروں میں بہت بے سُرا گاتی ہیں۔ تب تحریم نے اسے بے نقط سنائیں۔ ادھر احمد سیال کو بھی اطلاع مل گئی کہ ان کی دختر نیک اختر خیر سے گلوکاری کا شوق پورا کررہی ہیں اور یہ اطلاع پہنچائی بھی تو کس نے اشعر شیرازی نے جو اس دن اتفاق سے اپنے کزن کے ساتھ یونیورسٹی کے اس فنکشن میں موجود تھا۔ اشعر کا کزن یہاں پڑھتا تھا اشعر اس کے ساتھ آیا تھا۔ اگر تحریم کو ذرا بھی غیب کا علم ہوتا تو وہ یونیورسٹی فنکشن میں گانے کی حماقت نہ کرتی کیونکہ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ اس کے لیے اشعر شیرازی کا رشتہ آیا ہوا ہے اور اس کی تصویر اشعر کے گھر والوں کے پاس ہے۔ رشتے اس کے لیے آرہے تھے یہ نئی بات نہیں تھی مگر یہ بات حیرت انگیز تھی کہ گھر والوں نے اس کی تصویر اشعر کے گھر والوں کو دی تھی کیونکہ احمد سیال اس حق میں نہیں تھے کہ لڑکا گھر آکے براہِ راست ان کی بیٹی کو دیکھے۔

اشعر کے گھر والوں کو تحریم بہت پسند آئی تھی اب اشعر کو لڑکی دکھانے کا مرحلہ تھا۔ احمد سیال کسی صورت راضی نہیں تھے۔ تحریم کی فوٹو اشعر کو دکھائی گئی۔ اس نے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ ان محترمہ کو تو میں گاتے ہوئے سن چکا ہوں۔ یہ بات احمد سیال تک بھی پہنچ گئی اور انہوں نے فوری طور پر یونیورسٹی جانے پر پابندی لگادی۔ اس بار رونا پیٹنا، منتیں، ترلے، آہ وزاریاں کچھ بھی کام نہیں آیا۔ تحریم کو بھی خبر ہوگئی کہ یہ فساد کی جڑ اشعر شیرازی کا کام ہے۔ اس نے پہلے دن سے ہی بیر باندھ لیا۔ دھوم دھام سے منگنی ہوئی تحریم نے منہ ٹیڑھا اور ماتھے پر تیوریاں سجائے رکھیں وہ اشعر شیرازی کو کسی قسم کی رعایت نہیں دے سکتی تھی۔

منگنی کے بعد کمالِ جرات سے کام لیتے ہوئے اس نے اپنی کزن کے ذریعے اشعر شیرازی تک دل کی بات پہنچادی کہ میری یونیورسٹی آپ کی وجہ سے چھوٹی ہے، میرا گلوکاری کے میدان میں برائیٹ

فیوچر آپ کی وجہ سے ختم ہوا ہے، میں آپ کو چھوڑوں گی نہیں اور اپنی طرز کی انوکھی انوکھی بددعائیں بھی اس نے اشعر کو دیں۔ وہ تو سن کے بہت ہنسا۔ منگنی کے دو سالوں میں اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح تحریم سے ایک بھرپور ملاقات کرلے پر فریق مخالف راضی نہیں تھا۔ لاکھ کوششوں کے بعد تحریم، اشعر کی کزن کی شادی میں آئی پر اشعر کی بھرپور ملاقات کی حسرت پوری نہیں ہوئی۔ اسے دور سے ہی دیکھ کے دل کو تسلی دینی پڑی۔ اشعر کو وہ اچھی لگنے لگی تھی مگر دوسری طرف سے مستقبل کے خوفناک عزائم کا اظہار تھا اور بونس میں بددعائیں الگ تھیں۔

شادی کے پہلے دن جب وہ اس کے پاس تھی اشعر کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ تیس مار خان حسینہ ہی ہے جو بھیگی بلی بنی بیٹھی ہے بس پھر کیا تھا اشعر نے یونیورسٹی والی پرانی کہانی سنادی۔ تیس مار خان حسینہ نے جو دھمکیاں پہلے کزن کے تھرو پہنچائی تھیں اب بانگ دہل اس کے منہ پر دے دیں۔ وہ ہنستا چلا گیا، اس کا یہ ہنسنا تحریم کو رلا گیا۔ پورے دو سال وہ یونیورسٹی اور گلوکاری کا سوگ مناتی رہی اور یہ اشعر شیرازی مجال ہے جو اس کی اشک شوئی کی ہو۔

اشعر نے اپنے ناکردہ جرائم کے ازالے کے طور پر پہلی فرصت میں اس کا ایڈمیشن یونیورسٹی میں کروایا اور خود جاب کے سلسلے میں کراچی چلا گیا۔ اب تحریم کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا کیونکہ اب وہ اشعر شیرزای کی بیوی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر تحریم کا دل گلوکاری سے اچاٹ ہوگیا اور اشعر شیرازی کی طرف جھکتا گیا۔ اس اشعر شیرازی کی طرف جو کراچی میں بیٹھا اس کا دل جلا رہا تھا۔ لاہور چھٹی لے کے آتا اور تین چار دن رہ کر چلا جاتا۔ جتنے دن گھر رہتا وہ اور اس کے دوست ہوتے۔ باقی رہ گئی تحریم تو اس کو اشعر نے اپنے شوق پورے کرنے کی آزادی دی ہوئی تھی۔

وہ کیسے کہتی کہ میرے شوق دم توڑ گئے ہیں اور گلوکاری کے بجائے تم میرا شوق اور جنون بن گئے ہو۔ اشعر شیرازی بھی اپنے نام کا ایک تھا...... بے پروا اور بے نیاز بن کے آتشِ شوق اور ذوق کو ہوا دیتا رہا اور پھر آپ اپنے دام میں صیاد آگیا کے مصداق تحریم کے سب خوفناک عزائم دم توڑ گئے۔ اب وہ اکثر رنگ کالا ہوگیا وے، میں تیرے ہجر دی ماری... سنتی پائی جاتی۔ اب اس کے شوق کا محور بدل گیا۔

اشعر کی جاب بہت اچھی تھی۔ اسے کمپنی کی طرف سے گھر گاڑی ملازم سب کچھ ملا ہوا تھا۔ تحریم نے شوقِ وصال میں کراچی کے لیے رختِ سفر باندھا اور اشعر کے پاس پہنچ گئی۔

وہ سیر تھی تو اشعر سوا سیر تھا۔ لال کتاب کی صورت میں اس کے پاس تحریم کے جرائم کی لمبی فہرست تھی۔

''دو سال میں چار لال کتابیں تیار ہوگئی ہیں، ہر کتاب کے ہزار صفحے ہیں اور ہر صفحے پہ سو سزائیں ہیں۔'' وہ مسکراہٹ لبوں میں دبائے بتا رہا تھا۔ غم وغصے کا طوفان تحریم کے دل میں بپا تھا۔ ابھی اشعر سزائیں سنا ہی رہا تھا کہ اس نے دو دو انچ کے ناخن اشعر کی کلائی میں گاڑ دیے۔

''میں نے تو سہہ لیا ہے آہ تک نہیں کی مگر تم کیا کروگی لال کتاب کی سزاؤں کا؟'' سوال جتنا خوفناک تھا اس کے نتائج اتنے ہی خوب صورت تھے۔

زویا شادی کے چار سال بعد اس کی گود میں آئی تو اشعر خوشی سے پاگل ہوا تھا۔ وہ تحریم کو چڑاتا، میں نے تو تمہیں اپنی محبت کی نشانی دی ہے تم نے کیا دیا ہے۔ تب وہ اس کی توجہ ان نشانات کی طرف مبذول کرواتی جو اس کے ناخنوں کے مرہونِ منت تھے۔

☆☆☆

اس نے کچن کے دروازے کے آگے جمے کھڑے اشعر کو زبردستی سامنے سے پرے کیا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔

''مما کیا ہوا؟'' زویا نے اس کی قمیص کا دامن پکڑ لیا۔

''مجھے اس گھر میں پاگل، احمق اور بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ میرا مذاق اڑایا جاتا ہے۔'' تحریم نے غصے سے لال انگارہ ہوتی آنکھیں اشعر کے چہرے پر جمادیں۔

''کیا، کہا...... سمجھا جاتا ہے'' مجھے اس جملے پر اعتراض ہے۔''

''کیا اعتراض ہے؟'' وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولی۔

''مجھے آج تم وہ سونگ سناؤ گی جس کی تیاری زویا کو کروارہی ہو اور ابھی جو کچن میں بھی گنگنارہی تھیں۔'' اس بار اشعر کا لہجہ و انداز بالکل سادہ تھا سو تحریم کو ایمان لاتے ہی بنی۔

''میں زویا کو سلا آؤں پھر سناتی ہوں۔'' تحریم کی آواز میں خوشی کی کھنک در آئی۔

''آؤ دونوں سلاتے ہیں زویا کو میری بیٹی میری جان۔'' اشعر نے زویا کو گود میں اٹھالیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے کمرے میں آئے۔

زویا ان دونوں کے درمیان تھی۔ اشعر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ تحریم دونوں باپ بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ تحریم سے زیادہ اشعر، زویا کے لاڈ اٹھاتا اس کی ضدیں پوری کرتا۔ بیٹی کے معاملے میں وہ بہت حساس تھا اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والا۔ ابھی دو ہفتے پہلے زویا کو بخار ہوا تو پوری رات اس نے جاگتے گزار دی تھی۔ آفس سے آنے کے بعد اسے لے کر بیٹھ جاتا اور سارے دن کی روداد سنتا۔ جب تک وہ نہ سوتی اشعر بھی جاگتا رہتا۔ ایسا ہی پاگل تھا وہ۔ برملا کہتا یہ ہم دونوں کے وجود کا حصہ ہے میں تو جتنا بھی پیار کروں کم ہے۔

زویا دس منٹ کے دوران سوچکی تھی۔ اشعر نے سوئی ہوئی بیٹی کے ماتھے پر بھرپور پیار کی مہر ثبت کی۔ زویا کے ماتھے پر جھکتے جھکتے ہی اس کے سر کے اگلے حصے میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ اذیت اتنی زیادہ تھی کہ ضبط و برداشت کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہاں سے لڑکھڑاتے قدموں سے نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے پریشان صورت لیے تحریم تھی۔ اپنے کمرے میں آکے اشعر جوتوں سمیت بیڈ پر جیسے گر سا پڑا۔ دونوں ہاتھ سر کے گرد جمے تھے۔

''بہت درد ہے؟'' تحریم نے نرمی سے اس کے ہاتھ سر کے گرد سے الگ کرنے چاہے مگر اس نے اور بھی سختی سے سر کر پکڑ لیا۔

''تحریم لائٹ بند کرکے چلی جاؤ پلیز، خود ہی آرام آجائے گا۔'' اشعر کی آواز سے بھی تکلیف کا اظہار ہورہا تھا۔ تحریم باہر تو نہیں گئی پر اٹھ کر لائٹ اور دروازہ دونوں بند کردیے اور خود آکے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے اشعر کے اس درد کی سب کیفیت معلوم تھی۔ کچھ گھنٹے اسے ایسا ہی شدید اذیت ناک درد رہتا تھا پھر آہستہ آہستہ آرام آجاتا۔ تحریم صوفے پر ہی لیٹ گئی کافی دیر بعد جانے کب آنکھ لگی۔

اشعر کو رات کے آخری پہر اس درد سے کچھ حد تک آرام آیا تب اس نے لائٹ جلا کے ٹائم دیکھا۔ تحریم سکڑی سمٹی صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ اشعر کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان آگئی، اگر رات اس کے سر میں درد نہ ہوتا تو تحریم نے اس سے خوب لڑائی کرنی تھی کہ آپ نے میری آواز کا مذاق کیوں اڑایا تھا۔

وہ بیڈ سے اتر کے اس کی طرف آیا جو بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ مسکراہٹ دباتے ہوئے اشعر نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ فوراً جاگ گئی اور تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپ کو آرام آیا؟'' اشعر کا کندھا پکڑے وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

''تم اپنی نیندیں پوری کرو، ایسی ہوتی ہیں بیویاں، میں درد سے مر رہا ہوں اور تمہیں نیند کی پڑی ہے۔'' اشعر نے ساری شرارتیں چھپالیں۔ اس کی توقع کے عین مطابق سب سے پہلے تحریم کی آنکھوں میں آنسو آئے۔

''آپ کو نہیں پتا میں کتنا پیار کرتی ہوں آپ

سے، آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ جب مجھے درد ہو اکیلا چھوڑ دو۔ ہر دفعہ آپ ایسا کرتے ہیں۔ جب بھی آپ کے سر میں درد ہوتا ہے آپ کمرا بند کرلیتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں باہر جاؤ۔''

''تم مجھے تکلیف میں اکیلا چھوڑ و گی ایسے ہی۔'' اشعر نے اس کی آنکھوں کو لال ہوتے دیکھا۔ ''میں مذاق کررہا تھا تحریم۔'' اشعر نے انگلی کی پور سے اس کی آنکھ سے نکلنے والا پہلا آنسو صاف کیا۔

''آپ ٹھیک ہیں اب۔''

''ہاں میں ٹھیک ہوں، تمہیں پتا ہے کچھ گھنٹے شدید درد کے بعد آہستہ آہستہ آرام آتا ہے تو اب میں بالکل سکون میں ہوں۔''

''آپ کو کیوں ہوتا ہے یہ درد؟'' تحریم اس کے کندھے سے لپٹ سی گئی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم کیوں ہوتا ہے مگر تحریم جب بھی یہ درد ہوتا ہے میرے ساتھ کچھ تکلیف دہ کچھ انہونی ہوتی ہے۔ مجھے نہیں پتا یہ سب کیا ہے مگر جو بھی ہے بہت اذیت ناک ہے۔'' اشعر کے تاثرات میں اب کی بار کچھ فکرمندی بھی تھی۔

''ڈونٹ وری، آئیں سوتے ہیں۔'' تحریم اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے بیڈ کی طرف آئی۔ ''آپ کو اب درد تو نہیں ہورہا؟'' تحریم نے تکیہ سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، نہیں اب نہیں ہورہا ہے کیونکہ میرے درد کا درماں جو میرے پاس ہے۔'' اشعر نے پوری سنجیدگی سے یہ سب کہا تھا۔

''اور آپ کچن میں جو میرا مذاق اڑا رہے تھے وہ سب کیا تھا؟'' تحریم سحر انگیز نشیلی آنکھیں جمائے بڑی دھونس سے پوچھ رہی تھی۔

''وہ تو میری محبت ہے، تمہیں تنگ کرتا ہوں......''

''اور میری محبت بھی تو آپ کو معلوم ہوگی اس کے رنگ ڈھنگ قرینے قاعدے......'' تحریم نے اس کے بازو میں بڑے زور سے ناخن چبھویا تھا۔

''میرے قاتل میرے دلدار بتا دو قرینے اور ڈھنگ اتنے سالوں سے یہ ظلم و ستم سہتا آرہا ہوں......'' جہاں تحریم نے ہلکا سا ناخن چبھویا تھا...... وہاں خراش نظر آرہی تھی۔ اشعر دیکھ رہا تھا۔

''ہاں تو پھر......؟'' کیا اسٹائل تھا نہ ڈرنے والا نہ دبنے والا کی عملی تفسیر...... اشعر ہنستا چلا گیا۔ وہ چڑ کے اس کے مکا مارنے لگی تھی جب اس نے ہاتھ تھام لیا۔

''اب میرا رنگ ڈھنگ بھی تو دیکھو، لال کتاب پوری طرح بھر گئی ہے۔'' تحریم کو آنکھ اٹھا کے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی اس بار۔

☆☆☆

زویا کے فرینڈشپ ڈے کے موقع پہ ہی تحریم اور اشعر کی ویڈنگ اینورسری بھی تھی۔ تحریم چپکے چپکے تیاری کررہی تھی۔ اس نے اشعر کے لیے گفٹ بھی لاکے رکھ دیا تھا اور اپنے لیے بہت ہی خوب صورت سوٹ لیا تھا۔ وہ اس خاص دن کو یادگار بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ اینورسری سے ایک دن پہلے اشعر کو بیڈ روم بدر کردیا جاتا۔ تحریم پھولوں سے سارا کمرا سجاتی، جگہ جگہ پھول مہک رہے ہوتے۔ ٹھیک رات بارہ بجے تحریم اشعر کے ساتھ کمرے کا لاک کھولتی، اسے باہر کھڑا کرکے خود اکیلے اندر جاتی پھر پانچ منٹ بعد اشعر کا ہاتھ پکڑ کے بیڈ روم میں لاتی اور اسے آنکھیں کھولنے کا کہتی۔ یہ منظر اشعر کو ازبر ہوچکا تھا۔ وہ ہر بار ایسے ری ایکٹ کرتا جیسے اس کی توقع نہ کررہا ہو۔ اشعر آنکھیں کھولتا، کمرے میں جگہ جگہ موم بتیاں روشن ہوتیں، پھول مہک رہے ہوتے اور لائٹیں آف ہوتیں۔ تب دونوں مل کے کیک کاٹتے۔ خلاف توقع تحریم اس دن اچھی بچی کی عملی تفسیر پیش کرتی۔ گفٹ دیتی سعادت مندی سے اسے کیک کھلاتی۔ اس سعادت مندی کے پیچھے بھی وہی دکھ بھرا قصہ تھا جس کے نتیجے میں اس کی یونیورسٹی چھوٹی اور شادی کی پہلی

رات ہی تحریم زار زار روئی تھی۔ شادی کے اولین سالوں کی جفا کا ازالہ کرنے کی خاطر وہ بادل کی طرح برستی اور اشعر شرارت سے کہتا کہ کاش سال کے 365 دن ہی ہماری ویڈنگ انیورسری ہو۔

تحریم نے دلبر خان سے جو باہر کے سب کام کرتا' اس کے سپرد پھول لانے کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ اس نے کل پھول لانے جانا تھا۔ تحریم نے خاص طور پر اس کے لیے اپنے پڑوسی زبیر سے گاڑی مانگی تھی اس میں پھولوں کی مطلوبہ تعداد آرام سے سما جاتی۔

زویا اسکول سے آئی تو تحریم نے کھانا کھلا کے اسے سلا دیا۔ اشعر آفس سے گھر پہنچا تب بھی زویا سو رہی تھی۔ وہ خود بھی کپڑے بدل کے اس کے پاس نیم دراز ہو گیا۔

''اشعر اپنے روم میں جائیں، زویا کو سونے دیں۔'' تحریم سے اس کا محبت بھرا انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ زویا کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اور اس نے جاگ جانا تھا۔

''نہیں جاتا، اِدھر ہی سوؤں گا، اپنی بیٹی' اپنی رانی اور اپنی پری کے پاس۔ تم کیوں جل رہی ہو؟'' اشعر نے اسے چڑایا۔ تحریم کی توقع کے عین مطابق زویا جاگ گئی۔

''میری بیٹی، میری شہزادی۔'' اشعر نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ جواباً زویا نے بھی پیار کا اظہار کیا تو وہ پھیل گیا۔

''ایک کس میری آنکھوں پہ ایک گالوں پہ ایک یہاں، ایک یہاں......'' زویا معصومیت سے اس کی فرمائش پوری کرنے لگی۔

''پپا جانی آئی لو یو......'' وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

عین اسی لمحے اشعر کے سر میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی۔ درد کا یہ دورانیہ صرف چند سیکنڈز ہی پر محیط تھا جو اشعر کو عجیب سے احساسات سے دوچار کر گیا۔ اس نے تحریم سے اپنے اندرونی احساسات چھپا لیے ورنہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ ابھی رونے بیٹھ جاتی۔ ایسی ہی بات بات پر نیر بہانے والی تھی وہ۔

زویا کو سینے میں چھپائے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک نمکین قطرہ پھسلا جو زویا کے بالوں میں ہی کہیں گم ہو گیا۔

☆☆☆

تیرے سنگ دوستی
ہم نہ چھوڑیں کبھی
سنگ اپنا رہے نہ رہے
آج بچی ہے تو
کل بنے گی ممی
اپنے بچوں کا دل یونہی بہلائے گی
نام جیون ملن اور جدائی کا ہے
تیرے رستے میں بھی موڑ یہ آئے گا

زویا دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے بہت محویت اور دلچسپی سے تحریم کے لبوں سے برآمد ہونے والی گنگناہٹ کو سن رہی تھی۔

''مما ہم کبھی بھی فرینڈ شپ بریک نہیں کریں گے۔'' جب تحریم کی گنگناہٹ مدھم ہوئی تو بے ساختہ زویا نے یہ جملہ کہا۔

''ہاں بیٹا نیور ایور۔'' تحریم کے لہجے میں بھرپور یقین نمایاں تھا۔

''چلو، اب مجھے آپ یہ سونگ سناؤ کل فرینڈ شپ ڈے ہے۔ آپ کی تیاری فل ہونی چاہیے۔''

''اوکے مما۔'' زویا سعادت مندی...... سے اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔

اس کے اسکول میں آئے دن مختلف دن دھوم دھام سے منائے جاتے اور اس مد میں بھاری رقوم والدین کی جیب سے نکلوائی جاتی۔ یہ سب ادا کرتے ہوئے اشعر کے ماتھے پر کبھی بل نہیں پڑے۔ زویا شہر کے مہنگے ترین اسکول میں زیر تعلیم تھی۔ ساری ٹیچرز کی وہ پسندیدہ اور لاڈلی تھی۔ فرینڈ شپ ڈے پہ ہونے والے فنکشن میں اسے دوستی، امن اور محبت کی علامت

کے طور پہ پیش کیا جانا تھا کیونکہ باہر سے تعلیمی دورے پہ آئے ہوئے کچھ نمائندے بھی مدعو تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اعلیٰ سرکاری شخصیات نے بھی آنا تھا' سو اسکول میں تیاریاں عروج پر تھیں۔ ادھر گھر میں تحریم' زویا کو فرینڈ شپ سونگ کی ریہرسل کروا رہی تھی۔ اس طرف سے وہ اب مطمئن تھی۔

☆☆☆

''چلیں اٹھیں نکلیں یہاں سے جلدی۔'' تحریم لڑنے والے اسٹائل میں کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے اشعر کو دیکھ رہی تھی۔

''کیوں جاؤں میں یہاں سے، میرا روم ہے' کہاں سوؤں میں۔'' وہ ہٹ دھرمی پہ آمادہ... دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ بھول رہے ہیں محترم اشعر صاحب کہ یہ صرف آپ کا ہی روم نہیں ہے اس پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا ہے، اس لیے آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔'' مجال ہے جو وہ رعب میں آئی ہو۔ اس نے اشعر کو بازو سے پکڑا اور نیچے اپنی طرف کھینچا۔

''بہت سال ہو گئے ہیں مجھے یہ غنڈا... گردیاں برداشت کرتے ہوئے۔ اب اور نہیں کروں گا۔'' اشعر نے غصے سے اس کا بازو پرے کیا اور دھم دھم کرتا کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر آنے سے پہلے وہ دروازے کو پاؤں سے زوردار ٹھوکر لگانا نہیں بھولا تھا۔ اسے بھی تو احتجاج کا پورا حق حاصل تھا۔ مگر تحریم چکنا گھڑا تھی اس نے آج کے دن مائل بہ کرم نہیں ہونا تھا۔ اس کے لیے صبر سے کل کا انتظار کرنا تھا۔ جب اس نے گھٹا کی طرح برسنا تھا۔

☆☆☆

اشعر ٹی وی لاؤنج میں پڑے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ زویا کی کل اگر چھٹی ہوتی تو وہ تحریم کو ستانے کے لیے بدلہ لینے کے لیے اسی کو جگا دیتا۔ لیکن کل اس کے اسکول میں فنکشن تھا اس کے لیے پُرسکون نیند ضروری تھی اور اشعر کو اپنی پری اپنی شہزادی اپنی بیٹی زویا کی نیند بہت عزیز تھی۔

تحریم اسے باہر نکالنے کے بعد کمرا سجا رہی تھی۔ دلبر خان نے اسے ڈھیروں ڈھیر پھول لا دیے تھے وہ جگہ جگہ انہیں بکھیر رہی تھی ترتیب دے رہی تھی سجا رہی تھی۔ تازہ پھول اس نے گلدانوں میں سجانے تھے۔ سفید پھولوں کو گل دستے کی شکل میں ترتیب دینے کے بعد اس نے جہازی سائز بیڈ کے عین وسط میں سجایا۔ یہ اس کی طرف سے دوستی کا اظہار تھا جو اشعر کو از حد عزیز تھا۔

سب سے آخر میں تحریم نے مومی شمعوں کو پورے کمرے میں جگہ جگہ ترتیب اور فاصلے سے رکھا۔ کل رات اس نے .... ان کو جلانا تھا۔ فینسی لائٹ وہ آف کر دیتی۔ رات کے اندھیرے میں مومی شمعیں' گلاب کے پھول اور ان کی مہک خوابناک منظر پیش کرتی۔ ان سب دل کشیوں اور رعنائیوں کے بیچ تحریم، اشعر سے دلہن کی طرح سج بن کے ملتی اور ان سب شکوؤں کو دور کرنے کی کوشش کرتی جو اشعر کو شادی کے اولین کچھ سالوں سے تھے۔

کافی دیر کے بعد تحریم فارغ ہونے کے بعد کمرے سے نکلی۔ دروازہ لاک کر کے چابی چھپانے کے بعد اس نے ٹی وی لاؤنج کا رخ کیا جہاں اشعر کشن بازوؤں میں دبوچے مار دھاڑ سے بھرپور فلم دیکھ رہا تھا۔ تحریم جان کے ہولے سے کھانسی پر مجال ہے جو اشعر نے توجہ دی ہو۔ اس نے ٹیبل پر پڑا ریموٹ کنٹرول اٹھا کے چینل بدل دیا۔ اشعر نے ریموٹ کنٹرول چھین کے دوبارہ فلم لگا دی۔ اشعر کے لال بھبوکا چہرے پر شدید غصہ اور ناراضی تھی۔

''اے میرے ہم سفر اک ذرا انتظار۔''

تحریم مدھم سُروں میں گنگنائی۔ اشعر پوری طرح فلم کے مناظر میں گم تھا۔ اسے مزید چھیڑنے کا ارادہ ملتوی کر کے تحریم دوسرے کمرے میں آ کے سوئی۔ اسے کل جلدی اٹھنا تھا بہت سے کام کرنے

قدر داں کیسے کیسے

آج ایک عرصے کے بعد میری عروسہ سے فون پر بات ہوئی...... بات ہوتی بھی کیسے وہ تو اب سعودی عرب میں ہوتی ہے۔ ایک سال کے بعد اس کی آواز سن کر حسبِ عادت دوستوں سے کرنے والا پرانا سوال دہرایا۔

''اور سناؤ کیا مصروفیت رہتی ہے، ان دنوں کس کو پڑھ رہی ہو؟'' میرے اس سوال پر جو جواب آیا اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔

''پڑھنا لکھنا تو عرصہ ہوا ماضی کا حصہ بن چکا ہے، اب کون اپنا وقت ضائع کرے۔ بس کمپیوٹر، فیس بک اور موبائل نے اتنا مصروف کر دیا ہے کہ کتاب پڑھنے میں لگتا ہے وقت کا زیاں ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح بڑی برق رفتاری سے گفتگو کر رہی تھی۔

''اچھا......!'' میرا اچھا مارے حیرت کے بہت لمبا ہو گیا۔

''اور کیا کرن...... تم بتاؤ حسیب بھائی کیسے ہیں بچے تو اب بڑے ہو گئے ہوں گے...... شاپنگ وغیرہ کیسی چل رہی ہے، طارق روڈ اور آشیانے کے چکر لگ رہے ہوں گے، کون سا کلر آج کل ان ہے؟'' مجھے بھی بروقت جواب سوجھا۔

''عروسہ اب کہاں شاپنگ اور اس کے مزے، وہ تو تم ساتھ ہوتی تھیں تو وہ بات اور تھی بہت وقت ضائع ہوتا ہے اب کون بے ہنگم ٹریفک میں پھنس پھنسا کر بازار جائے...... ہاں بہت ضروری ہوتا ہے تو ہیلی کاپٹر سے چلی جاتی ہوں۔ ٹائم جو بچ جاتا ہے۔''

''ہاں...... ہاں یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہو...... مگر آں...... یہ ہیلی کاپٹر کیا مطلب...... اب کیا اوور ہیڈ برج کی تعمیر کے بعد کراچی میں ہیلی کاپٹر سروس بھی انٹروڈیوس کرائی جا رہی رہے۔ بھئی کیا کمال کی بات کی......''
اور لائن کٹ گئی۔

من حیث القوم ہم وقت کے کتنے قدرداں ہیں یہ ہم سب بخیر و خوبی جانتے ہیں۔ ویسے اگر ہم سوچیں تو

بعض دفعہ ہم کو وقت کی اہمیت کا اندازہ کچھ زیادہ ہی ہو جاتا ہے مثلاً کم سے کم وقت میں منزل پر پہنچنے کے لیے ہم ٹریفک سگنل کی پروا کیے بغیر یہ جا وہ جا...... سارجنٹ کی وسل پیچھا کرتی رہ جاتی ہے۔
دوسری طرف ٹرین کی آمد سے پہلے پھاٹک بند ہونے کی صورت میں ہم سائیکل یا بائیک جان ہتھیلی پر رکھ کے پٹری کراس کر جاتے ہیں اور پھر پیچھے مڑ کر رکی ٹریفک پر ایک فاتحانہ نظر ڈالتے سامنے کھڑے ہو کے بندر کا تماشا دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ اور دیکھنے والے ہماری اس جرأت رندانہ پر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ اور ہم دوسری طرف گاڑی میں بیٹھے منیر نیازی کے اس شعر کی کہ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔

ہماری وقت کی بچت کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگا سکتے ہیں کہ ہم کبھی بھی کسی جگہ لائن بنا کر اپنی باری کا انتظار نہیں کرتے بلکہ دھکم پیل کرتے اپنی جوانمردی کا مظاہرہ کرتے آگے سینہ تان کر جا کھڑے ہوتے...... اس طرح انتہائی قیمتی وقت بچ جاتا۔ اب تو ہم وقت کی بچت کے سلسلے میں اتنے حساس ہو چلے ہیں کہ ہارن بجاتی ایمبولینس کو بھی راستہ نہیں دیتے بلکہ اپنی اسپیڈ مزید بڑھا کر اس سے آگے نکل جانے کی.... بھرپور کوشش کرتے آخر ہم جو ٹھہرے ''فری سگنل'' کے متوالے...... ''ہم سا ہو تو سامنے آئے'' ہماری اس قدر فراوانی سے وقت کی قدر کرنے کے آپ بھی قائل ہوئے بغیر نہیں رہیں گے کہ ہم کوڑے دان پیک دان اور سرکاری بیت الخلا کے استعمال سے انتہائی گریز کرتے ہیں۔ ''زیرِ دیوار بیٹھے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں کی تصویر بنے پھرتے ہیں یا بہترین نشانہ بازی اور پینٹنگ کے مظاہرہ در و دیوار اور پکیزیوزمی کے اطراف جان ماری جاری رکھتے ہیں کیونکہ ان کاموں میں ہوتا ہے وقت کا زیاں اور بھی زیادہ...... اور اپنے پیارے شہرِ قائد کو گل کاری کی پچکاریوں سے گل و گلزار بنانا اور سنوارنا بھی تو آخر ہمارا ہی کام ہے۔
اب یہی دیکھیں کہ ہم وقت کے کیسے قدردان ہیں کہ ابھی لکھنے اور کہنے سننے کو بہت کچھ باقی ہے مگر اب وقت کی بچت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ مضمون فیکس...... یا ای میل بھی تو کرنا ہے۔ تو عروسہ کی بات بھی اپنی جگہ اب درست ہی لگ رہی ہے کیوں...... کیسا......؟ آپ بھی یقیناً ہمارے ہم خیال ہوں گے۔

تسنیم منیر علوی، دبئی

تھے۔ اشعر کی پسند کے کھانے بنانے تھے۔ زویا کو اسکول سے لانا تھا کیونکہ ڈرائیور چھٹی پر گاؤں گیا ہوا تھا۔ صبح اسکول سے پک کرنے کی ذمے داری مسز اشمل نے لے لی تھی جو اس کی فرسٹ ڈور نیبرز میں تھیں اور زویا کے اسکول میں میوزک ٹیچرز کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ واپسی پہ بھی انہوں نے زویا کو لے آنا تھا پر اس طرح وہ بہت لیٹ گھر آتی کیونکہ فنکشن ساڑھے بارہ بجے ختم ہونا تھا اور مسز اشمل نے شام چار پانچ بجے گھر آنا تھا۔

''آپ فکر نہیں کریں۔ میں زویا کو ساڑھے بارہ بجے اسکول سے لے آؤں گی۔'' تحریم نے کہا۔ وہ بے خبری کی نیند سو چکی تھی۔ اشعر نے ٹراؤزر کی پاکٹ سے بیڈروم کے دروازے کی دوسری چابی نکالی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ اگر تحریم دیکھ لیتی تو اس کا حشر کر دیتی۔ اشعر بیڈروم کا دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اسی طرح دروازہ لاک کر کے ٹی وی لاؤنج میں آ گیا اور سب سے پہلے ٹی وی آف کیا۔ اب اسے بھی نیند آ رہی تھی۔

☆☆☆

تحریم نے زویا کے بھورے لمبے گھنے بالوں میں برش پھیرا پھر پونی بنائی۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ تحریم نے تنقیدی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ اتنے میں گیٹ کے باہر مسز اشمل کی گاڑی کا ہارن بجا۔ اشعر نے کھلے دروازے سے پنک اور وائٹ کلر کے قیمتی فراک میں ملبوس زویا کو دیکھا، وہ تتلی کی طرح لہراتی ہوئی گیٹ کی طرف جا رہی تھی اس کے ساتھ تحریم تھی۔ اشعر تیز تیز قدم اٹھاتا ان دونوں تک پہنچا اور زویا کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ بہت ہی معصوم اور کیوٹ لگ رہی تھی۔ اسی طرح گود میں اٹھائے اٹھائے اشعر نے اسے لا کر مسز اشمل کی گاڑی میں بٹھایا اور اس کے ماتھے اور گالوں پر پیار کیا۔ عین اسی لمحے.... درد و اذیت کی ایک لہر صرف پل بھر کے لیے اس پہ حاوی ہوئی اور پھر پلک جھپکتے ہی سب کچھ پہلے کی طرح نارمل ہو گیا۔

مسز اشمل نے رشک بھری نگاہ سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ خوب صورت اور نازک سی تحریم، مضبوط اور کڑیل سا اشعر اور ان کے پیار کی گواہی معصوم اور دل میں اتر جانے کی حد تک حسین زویا...... کتنی مکمل اور خوب صورت فیملی تھی۔

''پپا، مما آئی لو یو......'' مسز اشمل کے گاڑی

اسٹارٹ کرنے سے پہلے زویا نے تحریم اور اشعر کو پیار کیا۔ اشعر نے اسے محبت سے بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ وہ پلٹ پلٹ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ تب تحریم اور اشعر اندر آئے۔ تحریم کچن میں آگئی' اشعر کے لیے ناشتا بنانا تھا۔ وہ باتھ روم میں نہا رہا تھا۔ اس کے فارغ ہونے سے پہلے تحریم ناشتا بنا چکی تھی۔

کوئی تاثرات ظاہر کیے بغیر اشعر نے ناشتا کرنا شروع کر دیا۔ تحریم اس کے سامنے پڑی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ تب بھی اشعر کی بے نیازی برقرار رہی۔ تحریم کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ روٹھا روٹھا سا عزیز از جان یہ شخص اسے بہت پیارا تھا۔ اسے منانے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ ناشتے کے برتن کچن میں چھوڑ آئی۔ اتنے میں کام والی ماسی بھی آگئی۔ اسے مطلوبہ کام بتا کے تحریم اپنے کپڑے دیکھنے لگی جو سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اسے پہننے تھے۔ بہت خوب صورت قیمتی سا ریڈی میڈ سوٹ تھا یقیناً پہن کے تیار ہونے اور اشعر کے سامنے آنے کے بعد اسے تعریف ہی ملنی تھی۔

کپڑے اس نے دوبارہ خود پریس کیے اور ہینگ کر دیے۔ کپڑوں کے ساتھ میچنگ کانچ کی چوڑیاں، سینڈل اور دیگر لوازمات ساتھ ہی رکھے تھے۔ ایک ہاتھ میں وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے کون سے مہندی کے نقش و نگار بنائے۔ مہندی بہت جلد خشک ہوگئی۔ بڑا خوب صورت اور گہرا رنگ آیا تھا۔ لال لال خوش رنگ دل کو لبھاتا مہندی کا مخصوص رنگ و مہک اشعر کو بہت پسند تھی اور تحریم اس کی پسند کا پورا دھیان رکھتی تھی۔ زویا کو اسکول سے لانے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ تحریم نے جلدی جلدی کپڑے بدلے تیار ہوئی اور گاڑی نکالی..... کچھ دیر پہلے ہی اشعر دوسری گاڑی لے کر ناراضی کے عالم میں پھولا پھولا منہ لے کر بتائے بغیر نکلا تھا۔ تحریم کو سب خبر تھی وہ کہاں گیا ہے وہ اس کے لیے پھول اور گفٹ لینے گیا تھا۔ وہ عین وقت پہ ہی گفٹ لیتا تھا۔ اسے یہ شک تھا کہ تحریم جاسوسی کے ذریعے اور تلاشی لے کر دیکھ لے گی اور سب تجسس ختم ہوجائے گا۔ اس لیے انیورسری والے دن وہ یہ کام اکیلے جا کر کرتا تھا۔

☆☆☆

12.30

تحریم زویا کے اسکول کے گیٹ کے سامنے تھی۔

عین وقت پہ اچھلتی کودتی خوشی سے سرخ چہرہ لیے زویا گیٹ سے باہر نکلی۔ تحریم کو وہ دیکھ چکی تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور زویا کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھائی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ اسکول سے دائیں طرف کے روٹ پر مڑ رہی تھی۔ زویا اس دوران فرینڈ شپ ڈے کی ایک ایک تفصیل اسے بتا رہی تھی۔

تحریم کی توجہ ڈرائیونگ کی طرف کم اور اس کی طرف زیادہ تھی جس کے انداز و آواز میں دنیا جہان کا اشتیاق و خوشی محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ تفصیل بتا رہی تھی کہ اس نے کیسے پرفارم کیا۔ سب نے کتنی دیر تالیاں بجائیں سب نے کتنا پسند کیا، ٹیچرز نے کیا کیا کہا، اس کے پاس ایک سے ایک بات تھی۔ موڑ کاٹتے ہوئے تحریم نے اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور اپنی ہی نظر لگ جانے کے ڈر سے دل ہی دل میں ماشاءاللہ کہا۔

☆☆☆

12.40

اشعر شاپنگ مال میں تحریم کے لیے گفٹ دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی بھی چیز پسند نہیں آ رہی تھی۔ کافی مشکل کے بعد اس نے تحریم کے لیے پلاٹینم گولڈ کی چین اور لاکٹ لیا جو بہت نازک اور خوب صورت تھا۔ کیش کاؤنٹر پہ ادائیگی کرنے کے بعد وہ شاپنگ مال سے باہر نکلا اور پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف آیا۔ لاک کھولتے کھولتے وہ رک گیا عین وقت پہ یاد آیا کہ ابھی پھول اور اس ٹائپ کی دیگر چیزیں

لینی ہیں۔ تحریم کو سرخ رنگ کے گلاب بہت پسند تھے۔ اشعر اس کے لیے سرخ گلابوں کا بُکے ہر حال میں لاتا تھا۔

☆☆☆

1.10 منٹ

تحریم دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پہ رکھے سکون سے سگنل گرین ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک مصروف ترین شاہراہ پہ تھی جہاں گاڑیوں کی لمبی قطار ٹریفک کی بے ضابطگیوں کی وجہ سے انتظار میں رینگ رینگ کے سست رفتاری سے رواں دواں تھی۔ عام حالات میں یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ آٹھ سے دس منٹ میں طے ہوتا تھا....... اسے اسکول سے نکلے کم سے کم چالیس منٹ ہو رہے تھے اور ابھی آدھا راستہ بھی نہیں پورا ہوا تھا۔

تحریم کی گاڑی کے پیچھے موٹر بائیک پہ اٹھارہ سے بیس سال کی عمر کے درمیان کا نوجوان سوار تھا۔ اس نے گرم کپڑوں کے اوپر موٹی اونی چادر بھی اوڑھ رکھی تھی۔ موسم سرد تھا خنکی والا تھا مگر اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ موٹی گرم جرسی کے ساتھ اونی چادر بھی اوڑھی جائے۔ بہت سے لوگوں نے دیکھا بھی تو دھیان نہیں دیا۔ ویسے بھی یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی پھر کچھ لوگوں کو سردی بھی زیادہ لگتی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔

جیسے ہی سگنل گرین ہوا گاڑیاں سست رفتاری سے آگے بڑھنے لگیں۔ موٹر بائیک والے نے ہارن پہ ہارن دینے شروع کر دیے کہ تحریم تیزی سے گاڑی آگے بڑھائے۔ اسے اس طرح فضول ہارن دیے جانے پر غصہ آ گیا۔ آگے گاڑیوں کی لمبی قطار تھی وہ کیا آسمان پہ اپنی گاڑی اڑا لے جاتی۔ موٹر بائیک سوار کے چہرے سے اضطراب مترشح تھا' جانے اسے کیا الجھن درپیش تھی۔

☆☆☆

1.20 منٹ

اور اس وقت اشعر فلاور شاپ پر رکھے پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ سیلز مین اس کی پسند کے پھولوں کا بُکے بنا رہا تھا۔ وہ بُکے بنا چکا تو اس نے سفید موتیے کے پھول نکلوائے۔ سفید موتیے کے پھولوں کا زیور تحریم بڑے شوق سے پہنتی تھی۔ آفس سے واپسی پر وہ اکثر اس کے لیے گجرے لے جاتا اور آج تو وہ یہ تحفہ پا کے بہت خوش ہوتی آخر کو ان کی ویڈنگ اینورسری تھی۔

☆☆☆

ایک موٹر بائیک کب سے...... اس ٹریفک جام میں...... اس کی گاڑی کے قریب ترین چل رہی تھی۔ اسے نہ اس کا احساس ہوا تھا اور نہ ہی کوئی خدشہ۔

اپنی بیٹی کا مسکراتا چہرہ اور اس کے لبوں پر آنے والے...... محبت بھرے جملے اس کی آنکھوں کی قندیلوں کو روشن سا کر رہے تھے۔

''مما...... اگر مجھے فرسٹ پرائز مل گیا تو......؟''

بیٹی کا یہ سوال چھٹی مرتبہ تھا یا شاید بچے اپنی بات بار بار کہا کرتے ہیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح اس کا جواب ایک ہی تھا۔

''وہ تو میری گڑیا کو ملے گا ہی۔ اس میں شک کی کیا بات ہے...... بیٹا، اسکول سے ملنے والا ہر انعام فرسٹ پرائز ہی ہوا کرتا ہے۔''

''اخاہ...... تو پھر میں پرائز کے ساتھ گھر آؤں گی۔'' بیٹی نے خوشی سے تالی بجائی اور اسی لمحے ساتھ لگی ہوئی موٹر سائیکل میں زوردار دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی کار کے بھی چیتھڑے اڑ گئے۔ تالی کی گونج اس دھماکے میں نہ جانے کہاں دب گئی۔ ہاں لاشوں کے چیتھڑے آہ و بکا کے ساتھ ہر سو پھیل گئے تھے۔

اور اشعر ویڈنگ اینورسری کے لیے ڈھیر سارے پھول لیتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ آج اس کی طبیعت شاید ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے دل کی خوشی کو کیا ہوا ہے جو ان ڈھیر سارے پھولوں کو لے کر بھی اس کے آنسو اس کے دل پر ٹپک رہے تھے نہ جانے کیوں؟

نبیلہ ابر راجہ نے کہا

اس افسانے کے حوالے سے یہ کہنا ہے کہ گزشتہ سال "شعاع" کے سالگرہ نمبر میں ہی میں نے "دو انچ کی چوڑی" لکھا تھا۔ یہ اسی کا تسلسل ہے مگر کردار وہ نہیں ہیں۔ "دو انچ کی چوڑی" لفظ بہ لفظ حقیقت تھا اور اب "ہم اچھے دوست ہیں" بھی سو فیصد سچائی پر مبنی ہے۔

گزشتہ کچھ سالوں میں انٹرنیٹ کے پھیلاؤ اور موبائل فون کے بے دریغ غلط استعمال کے جو نتائج ہیں' یہ ان میں سے ایک ہے۔

ٹیلی فونک فرینڈشپ ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں تو ایک طرف بڑی عمر کے سنجیدہ افراد بھی اس معاملے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

کبھی ان کے چہرے سے بھی پردہ اٹھاؤں گی۔

اس بارے میں بڑے مزیدار واقعات ہوئے ہیں میرے اپنے ساتھ' سوچ کر ہی ہنسی آتی ہے مگر افسوس کہ لکھ نہیں سکتی۔ آف دی ریکارڈ ہیں۔ میری شرارتوں کا پول کھل جائے گا۔

اور اپنی تحریروں کے بارے میں کیا کہوں کہ

بہت شروع میں جب میں نے لکھنے کا آغاز کیا تھا تو تین اقساط پہ مبنی ناول "زرد زمانوں کا سویرا" لکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے اب لکھتی تو زیادہ اچھے طریقے سے لکھتی۔

کچھ ایسے ہی خیالات "عجیب مسافر دشت ہیں' زرد رتوں کا آخری پھول" اور "اب دل کو بھی سمجھانا ہے" کے بارے میں بھی ہیں۔ میں نے ان کو جس طرح جلدی جلدی لکھا' اب اگر لکھتی تو پہلے سے بہتر لکھتی۔

نبیلہ ابر راجہ

رات کے دو بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ فراز کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے تقریباً "دس منٹ پہلے رانیہ سے فون پر بات کی تھی۔ رانیہ کا جادو جو آج کل اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ کیا تھی وہ' نغمہ تھی' زندگی سے بھرپور ہنسی تھی یا پھر کسی شاعر کی غزل تھی وہ۔ سچ مچ اس لڑکی نے اسے حیران کر دیا تھا۔ فراز کا تو مشغلہ ہی یہی تھا۔ رات رات بھر جاگ کر لڑکیوں سے بات کرنا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اب تک وہ کتنی لڑکیوں سے دوستی کر چکا ہے۔ بنیادی طور پر وہ عاشقانہ مزاج رکھتا تھا۔ اچھے خاندان سے تعلق تھا۔ بات چیت'

انداز و اطوار اور لباس سے وہ کئی لڑکوں میں ممتاز نظر آتا۔ ان ہی خصوصیات کے باعث اسے لڑکیوں سے دوستی کرنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

سب سے پہلے جس لڑکی نے اس کی زندگی میں قدم رکھا' وہ حمیرا شاہ تھی۔ فراز کا دل چند دنوں میں ہی اس سے بھر گیا تھا۔ حمیرا کے بعد عاشی' علیمہ' رباب اور پھر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے اس کی زندگی میں آتی اور جاتی رہیں۔

کئی ایک کے لیے اس نے کشش بھی محسوس کی مگر بات اس سے آگے نہ بڑھی۔ وہ بہت جلد ان سے اکتا جاتا تھا' اس لیے کہ جو بھی اس کی نئی دوست بنتی' بہت جلد شادی کے تقاضے شروع کر دیتی۔ اور فراز کو

ان تقاضوں سے چڑ تھی۔

آج کل وہ حرا کے ساتھ دوستی کے نام پہ پیار کی پینگیں بڑھانے میں مصروف تھا۔

یہ تقریباً" ایک ہفتہ پہلے کی بات تھی۔ اس کا حرا کے ساتھ باہر جانے کا پروگرام تھا۔ ملاقات کا وقت اور جگہ طے تھی۔ موسم بڑا رومینٹک ہو رہا تھا۔ گزشتہ ایک ہفتے سے سخت گرمی اور حبس تھا۔ مگر اب آسمان پہ کالے کالے بادلوں نے یکلخت یلغار کر دی تھی۔

وہ اس وقت شکرپڑیاں میں تھے۔ بارش چھما چھم برس رہی تھی۔ اس نے حرا کو گاڑی سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ کچھ شرماتی ہچکچاتی نیچے اتر آئی۔

حرا کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اس کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا تھا جو فلمیں اور ڈرامے دیکھ دیکھ کر خود کو ان کا حصہ تصور کرنے لگتی ہیں۔ وہ لڑکوں سے دوستی کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھی۔ شروع شروع میں جب فراز کے ساتھ اس کی جان پہچان ہوئی تو فراز نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ لڑکے اور لڑکی کی پاکیزہ دوستی میں کوئی حرج نہیں ہے۔

"یار! ہم جدید دور میں سانس لے رہے ہیں۔ میں ان فرسودہ باتوں کو نہیں مانتا کہ عورت اور مرد میں میلوں کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ اس میں کسی کا کیا جاتا ہے۔ اگر ہم آپس میں چند منٹ کے لیے ہنس بول لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ کچھ شیئر کر لیتے ہیں۔ کیا کسی کا نقصان ہوتا ہے یا قیامت آجاتی ہے۔ میری اور تمہاری دوستی صاف ہے۔" اور حرا اس کی ہر بات سے متفق ہوتی چلی گئی۔

حالانکہ اس کے خاندان میں یہ بات معیوب سمجھی جاتی تھی۔ حرا کی چار بہنیں تھیں۔ انہوں نے ڈھکے چھپے ماحول میں پرورش پائی تھی' جہاں دوپٹہ سر سے ڈھلکتا تو شیطان اور دوزخ کے ڈراوے دیے جاتے۔ حرا بھی اسکارف اور گاؤن استعمال کرتی تھی۔ زندگی ایک دائرے میں قید تھی۔ کالج سے گھر اور گھر سے کالج۔ بس اس کی یہی مصروفیت تھی' اگر اس روز وہ اپنی دوست ملائکہ کے کزن کی گاڑی میں نہ بیٹھتی تو سب کچھ ویسا ہی رہتا جیسا پہلے تھا۔

حرا کی وین لگی ہوئی تھی جو اسے کالج سے گھر اور گھر سے کالج پک اور ڈراپ کرتی تھی۔ اس روز انتظار کرتے کرتے بیس منٹ ہو گئے لیکن پروین والے کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ تب ملائکہ جو اس کی دوست تھی اس نے اسے گھر تک ڈراپ کرنے کی آفر کی۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ملائکہ کے ساتھ اس کے کزن کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اور یہیں سے زندگی نے نیا موڑ لیا۔ فراز جیسے لڑکے کی توجہ اور دوستی کی آفر اس کے لیے خواب سا تھا۔

حرا کے پاس سیل فون تو نہیں تھا مگر ان کے گھر میں تین فون سیٹ تھے۔ ایک تو خراب تھا۔ دوسرا ٹی وی لاؤنج میں تھا اور تیسرا حرا کے کمرے کے باہر تھا۔

اس کی تینوں بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بڑے دونوں بھائی اپنی اپنی فیملی کے ساتھ الگ پورشنز میں تھے۔ امی جلدی سو جاتی تھیں۔ سو حرا کو کسی خاص دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

جب پہلی بار اس کی فراز سے فون پر بات ہوئی تو اس نے ٹی وی لاؤنج والے فون سیٹ کا تار نکال دیا مبادا اگر کوئی رات کو اٹھ کر اس طرف آئے بھی تو اسے یہ تاثر ملے کہ فون خراب ہے مگر اس کا چانس کم ہی تھا۔

اپنے کمرے سے باہر والا سیٹ اٹھا کر وہ اندر لے گئی اور خراب سیٹ وہاں پہ رکھ دیا۔ اب میدان صاف تھا۔

رات بارہ بجے کے بعد فراز کی کال آئی۔ اس نے بیل کا والیوم بالکل ہی کم کر دیا تھا۔ فراز نے بڑے مہذب انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

"حرا! ایک بات کلیئر کر دوں کہ مجھے آپ سے کوئی مطلب یا لالچ نہیں ہے۔ میں خود ویل سیٹلڈ فیملی سے تعلق رکھتا ہوں آپ سے صاف ستھرے انداز میں

فرینڈشپ کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ پہ اعتبار کریں۔ ہر بات مجھ سے شیئر کریں۔ دوستی کے رشتے میں کوئی دیوار اور تکلف نہیں ہوتا۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں آپ سے پہلے اس طرح کسی نے مجھے اٹریکٹ نہیں کیا اور نہ میں نے کسی کو دوستی کی آفر کی ہے۔ آپ کو دیکھتے ہی نہ جانے دل نے کیوں کہا کہ اس اسمارٹ سی' کھوئی کھوئی سی' نازک سی لڑکی کو دوست بنانا چاہیے۔" فراز نے باتوں باتوں میں اس کی تعریف کر ڈالی تو وہ سرخ ہو گئی۔

سترہ اٹھارہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ خواب دیکھنے کی عمر۔ سو وہ بھی اس کے لفظوں کے بھنور میں ڈوبتی چلی گئی۔

پہلے روز ان کی چار گھنٹے بات ہوئی۔ اس کے بعد ساری رات حرا کو نیند نہیں آئی۔ اگلے روز اسے فراز کے فون کا شدت سے انتظار تھا۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی وہ فون سیٹ کمرے میں لے آئی۔

گزشتہ روز کی طرح عام سے انداز میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے کرتے فراز نے اچانک پوچھا۔

"حرا! تمہیں کلر کون سا پسند ہے؟" وہ آپ سے تم کی دیوار پھلانگ آیا۔

"ریڈ" اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے' تم پرجوش لڑکی ہو۔" اور اس نے بات کی تہہ میں اترے بغیر ہاں کہہ دیا۔

"تمہیں کس قسم کے کپڑے پہننا پسند ہیں؟" اگلا سوال آیا۔

"میں تو سیدھے سادے کپڑے پہنتی ہوں' فل سیلیوز والے بڑے سے دوپٹے سمیت۔"

اچھا تم شرٹ فٹنگ والی پہنتی ہو یا ڈھیلی ڈھالی۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

"بس مناسب ہی ہوتی ہے۔"

"اصل میں تم گاؤن میں ہوتی ہو تو کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ کبھی گاؤن کے بغیر اپنا دیدار تو کراؤ نا' یار' ینگ ایج میں ہو اچھی خاصی خوبصورت لڑکی لگی ہو مجھے۔ خود کو یوں چھپا چھپا کر نہ رکھو۔ یار یہ عمر انجوائے کرنے کی ہوتی ہے۔

خوبصورتی اور حسن کے داد لینے کی ہوتی ہے۔ چلو کسی دن ملتے ہیں۔" وہ آہستہ آہستہ اسے شیشے میں اتار رہا تھا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" اس نے کوئی اعتراض کیے بغیر منظوری دے دی۔

"صرف ٹھیک ہے سے کام نہیں چلے گا محترمہ۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئی۔

"مطلب یہ کہ ہم پہلے کسی اچھے سے ہوٹل میں جائیں گے' اس کے بعد میں تمہیں زبردست سا گفٹ لے کر دوں گا پھر ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ڈرائیو کریں گے' مگر تم کپڑے اچھے سے پہن کر آنا میرا مطلب ہے اپ ٹو ڈیٹ اسٹائل کے مطابق اور لائٹ سا میک اپ

بھی ہو۔"

"مگر اماں کیا کہیں گی' کالج آتے ہوئے جب میں اتنی تیاری کروں گی تو وہ پوچھیں گی نہیں؟" اس نے نکتہ اٹھایا۔

"یار کہہ دینا کالج میں فنکشن ہے۔" اس نے فضول سا بہانہ بھی بتا دیا تو وہ شانت سی ہو گئی۔

دو دن بعد اس نے گھر میں کہہ دیا کہ بدھ کو کالج میں ہفتۂ طلبا منایا جا رہا ہے۔ بات آدھی سچ تھی۔ اسٹوڈنٹ ویک بدھ کے بجائے ہفتے سے شروع ہو رہا تھا۔

منگل کو اس نے اپنا نیا سوٹ نکالا۔ اس کی فٹنگ از سر نو کی اور آستینیں کاٹ کر آدھی کر لیں۔ سلائی اور کٹنگ میں تو اسے مہارت حاصل تھی کہ میٹرک کے بعد اماں نے اسے سلائی کڑھائی کا کورس کروایا تھا۔

☼ ☼ ☼

بدھ کو وہ کالج ٹائم پہ تیار ہو چکی تھی۔

امی باورچی خانے میں تھیں۔ حرا نے انہیں دروازے سے ہی خدا حافظ کہا۔

وین والے کو اس نے کالج سے قدرے پیچھے والی سڑک پہ گھر فون کرنے کا کہہ کر رکوا لیا۔

گاڑی باقی لڑکیوں کو لے کر آگے کالج کی طرف چلی گئی تو حرا نے پی سی او سے فراز کو فون کیا۔ وہ پچھلی سڑک پہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی فراز کی گاڑی تک پہنچی۔ اس نے اگلا دروازہ کھول دیا۔ ڈرتے ڈرتے وہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔

"یار! پہلے یہ کمبل اتار دو۔" فراز کا اشارہ اس کے گاؤن کی طرف تھا۔

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو..."

"کچھ نہیں ہوتا بابا۔ تمہاری اور میری اپنی زندگی ہے جس طرح چاہیں گزاریں کسی کو کیا۔ اور یہاں کوئی نہیں دیکھتا۔" اور پھر حرا نے اس کی باتوں کے زیر اثر گاؤن اتار دیا اور دوپٹہ شانوں پہ ڈال لیا۔

"یار! ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔ میرا خیال ہے' ابھی تو تمہیں بھوک نہیں لگی ہو گی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اندر سے وہ ڈر بھی رہی تھی۔ فراز نے اطمینان سے گاڑی موٹروے کے راستے پہ ڈال دی۔

"حرا! تمہارا فگر تو قیامت ہے' مس یونیورس کو بھی مات دے رہا ہے۔" فراز کی اس کھلی ڈلی بے تکلفی پہ وہ پانی پانی ہو گئی۔

"کم آن یار۔" اس نے حرا کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ بہر حال دو گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی۔ فراز نے کے ایف سی میں لنچ کروانے کے بعد اسے بڑا خوبصورت سا موبائل فون بمعہ کنکشن لے کر دیا۔ وہ ناں ناں کرتی رہ گئی۔ مگر وہ اسے موبائل فون استعمال کرنے کا طریقہ بھی سمجھا چکا تھا۔

وہ جیسے ہواؤں پہ چلتی گھر تک آئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے موبائل فون چھپایا۔

آنے والے ایک ہفتے میں وہ خود کو فراز کے کافی قریب تصور کرنے لگی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دوستی کا رشتہ اپنائیت میں بدل رہا ہو۔ کچھ دن کے بعد وہ پھر فراز کے ساتھ شکر پڑیاں میں تھی۔ بارش چھما چھم برس رہی تھی۔

حرا اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ فراز اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ اس کی نگاہوں کا اشارہ سمجھ گئی۔ اس نے اپنا نازک سا ہاتھ فراز کے ہاتھ میں دے دیا۔ فراز نے اسے خود سے قریب کر لیا۔

"آج تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو' اس کو کہتے ہیں سادگی میں پرکاری۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا ہوں کہ اتنی اسمارٹ لڑکی میری دوست ہے۔" وہ اس کی باتوں پہ نازاں سی تھی اس لیے اس کے آخری جملے پہ غور ہی نہیں کیا۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ اب حرا سے عادت کے مطابق بیزار ہونے لگا تھا۔ اس کا ارادہ ایک دو ہفتے میں حرا سے دامن چھڑانے کا تھا۔ اور اس میں تو وہ ماہر تھا۔

گھر واپس آنے کے بعد وہ کچھ دیر چیٹنگ کرتا رہا پھر جم چلا گیا۔ اس کا سب سے گہرا دوست انی اس کے ساتھ تھا۔

رات ساڑھے گیارہ سے اوپر کا وقت تھا جب اس کا سیل فون گنگنایا۔ اس نے اس نئے نمبر کو بغور دیکھا پھر فون آن کر کے کان سے لگایا۔

"ہیلو۔"

"السلام علیکم۔" دوسری طرف سے جواب آیا۔ وہ جو کوئی بھی تھی بے حد خوبصورت آواز کی مالک تھی۔

"جی تنویر بھائی سے بات کرنی ہے۔"

"مگر یہ نمبر تنویر بھائی کا تو نہیں ہے۔"

"اچھا' سوری۔ میں شاید غلطی سے یہ نمبر ڈائل کر گئی ہوں۔"

اس اجنبی آواز میں بڑا اعتماد تھا۔

"چلیں یہ خوبصورت غلطی ہو ہی گئی ہے تو اس پہ کیا پچھتانا۔ آپ سوچ رہی ہوں گی خوامخواہ فری ہو رہا ہے مگر یقین کریں آپ کی آواز میں جادو سا ہے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"میں فون بند کرنے لگی ہوں۔"

"نہیں نہیں ایسا مت کیجئے گا۔ اپنا پیارا سا نام تو بتا دیں اور کیا میں آپ کو فون کر سکتا ہوں؟"

"وہ کس خوشی میں؟" بڑا تیکھا لہجہ تھا۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان کسی دوستی کو نہیں مانتی۔"

"ہماری دوستی صاف ستھری ہو گی۔ پاکیزہ دوستی' بغیر کسی مطلب کے۔" وہ آہستہ آہستہ بات کو اپنے دلنشین انداز میں طول دے رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب رانیہ نے فون بند کیا تو وہ اسے دوستی کے لئے قائل کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

رانیہ نے فون بند کر دیا۔ ادھر حرا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"دیکھا' میں نہ کہتی تھی یہ لڑکا فراز جس کی تم سات آٹھ روز سے تعریفیں کر کر کے میرا سر کھا رہی ہو' سراسر فراڈ ہے۔ اب اس کا امتحان لینے کے لیے میں نے کال کی تو کیسے پہلی بار میں ہی گویا مرا جا رہا تھا۔" وہ اسے کچھ جتا رہی تھی۔

رانیہ' حرا کی خالہ زاد تھی اور دو ہفتے پہلے کراچی سے آئی تھی۔ اس کی حرا سے خوب بنتی تھی۔ رانیہ اکیس بائیس سال کی پرکشش اور باشعور لڑکی تھی۔ ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ آج کل چھٹیاں تھیں سو وہ پنڈی آئی ہوئی تھی۔ مگر یہاں حرا کے تو انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ رات کو فراز سے بات کرتے ہوئے رانیہ نے اسے پکڑ لیا تو حرا نے اسے سب کچھ بتا دیا' بتانے کے سوا چارہ بھی تو نہیں تھا۔

"تم آئندہ اس سے نہیں ملو گی۔ اگر وہ سنجیدہ ہے تو اسے کہو کہ اپنے بڑوں کو بات کرنے کے لیے بھیجے۔"

"آپی! فراز بہت اچھا ہے' مجھے سچ مچ چاہتا ہے' مخلص ہے میرے ساتھ۔"

"بس پھر تم دیکھتی جاؤ میں کرتی کیا ہوں مگر تم چپ رہنا۔" پھر رانیہ نے اس سے فراز کا نمبر لیا اور اسی وقت اس کے سامنے فون کیا۔ رانیہ نے اسپیکر آن کر رکھا تھا۔ اس لیے فراز کا لفظ لفظ حرا نے بھی سنا تھا۔

اس کے بعد رانیہ کے کہنے پہ اس نے فراز کو فون کیا تو اس نے ہمیشہ کی طرح کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

"حرا! تم اپنی پڑھائی پر بھی توجہ دیا کرو۔ میں سارا دن بزنس میٹرز کو دیکھتا ہوں' اتنا وقت نہیں ہوتا کہ رات بھر جاگ کر بات کروں۔ اچھے دوستوں کی طرح بی ہیو کرو۔" فراز نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تو وہ رانیہ کے سامنے رونے سے بمشکل خود کو روک پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

رانیہ کے ساتھ تین دن میں ہی وہ پوری طرح بے تکلف ہو چکا تھا۔ ادھر حرا کے ساتھ بادلِ نخواستہ وہ بات کر رہا تھا۔ پھر ایک روز وہ اصل بات پہ آ گیا۔"

"حرا! ایسا ہے کہ میں مزید پڑھائی کے لیے کینیڈا جا رہا ہوں' اب تم سے بات نہیں ہو سکے گی' میں تمہیں ہمیشہ مِس کروں گا ایک اچھے دوست کی طرح۔"

حرا تو جیسے پھٹ پڑی۔

تم مجھے اس مقام پہ چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"فراز! مجھے خواب دکھا کر چھوڑ جاؤ گے' پلیز رحم کرو مجھ پہ۔"

"اوہ تمہارا مطلب ہے میں تم سے شادی کر لوں۔ سوری بھئی' میں شادی تو کسی معصوم سی لڑکی سے کروں گا جیسے باہر کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ یار کیا ہو گیا ہے تمہیں' ہم اچھے دوست ہیں' میں نے کبھی تم سے آئی لو یو کہا یا شادی کا وعدہ کیا؟" وہ غضب کا معصوم بن رہا تھا۔

"وہ گھومنا پھرنا وہ میٹھی میٹھی باتیں' کیا تھا وہ سب؟" وہ بے قابو ہو رہی تھی۔

"کیا اچھے دوست گھوم پھر نہیں سکتے۔ بات نہیں کر سکتے۔" اس کی ہر بات کی تان اسی جملے پہ ٹوٹ رہی تھی کہ ہم اچھے دوست ہیں۔

رانیہ نے ہی اس سے فون لے کر بند کیا۔ وہ تو رو رو کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ ساری رات تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ اگلے روز اسے بہت تیز بخار ہو گیا۔ رانیہ اور باقی سب گھر والے بے حد فکر مند تھے۔

بنیادی طور پر حرا سادہ سی لڑکی تھی۔ اس لیے اس واقعہ کو سہنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ بخار سے اٹھی تو کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا' اداسی اور وحشت چھائی محسوس ہو رہی تھی۔ بڑی بُری طرح سے دل ٹوٹا تھا۔ کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔

☼ ☼ ☼

رانیہ نے پہلی بار سچ مچ اس کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا۔ وہ اس کے لیے دل میں بڑے خاص اور البیلے سے جذبات محسوس کر رہا تھا۔

وہ اس سے کتنی ہی بار ملنے کو کہہ چکا تھا۔ مگر پھر ہر بار وہ دامن بچا جاتی تھی۔

اس کی ذہانت اور ادبی ذوق نے اسے جیسے باندھ کر رکھ دیا تھا۔

فراز اسے دیکھنے کی خواہش میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔

پھر اللہ اللہ کر کے وہ ملنے پہ راضی ہوئی تھی۔

فراز نے بڑی زبردست تیاری کی۔ اپنا سب سے بہترین سوٹ پہنا۔ خوب پرفیوم لگایا۔ پھر گاڑی لے کر رانیہ کے بتائے ہوئے مقام پہ جا پہنچا۔

"ہائیں' یہ کیا؟ اس کے سامنے سر تاپا چادر سے ڈھکی ہوئی لڑکی کھڑی تھی۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ہاتھوں پہ بھی کاٹن کے گلوز تھے۔

"آپ سچ مچ رانیہ ہیں؟"

"کیوں' آپ کو شک ہے؟" وہ مسکرائی اس کی مترنم آواز نے تصدیق کر دی کہ وہ رانیہ ہی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

اس نیم خنک سے ریسٹورنٹ میں یہ گوشہ الگ تھلگ سا تھا۔

"رانیہ! آپ واقعی ماسٹرز کر رہی ہیں؟"

"ہاں' کیوں یقین نہیں ہے؟" وہ پھر مسکرائی۔

"ہاں۔ آپ کی آواز' آپ کی باتیں اور یہ سب میچ نہیں کر رہا ہے۔" فراز کا اشارہ اس کے باپردہ ہونے کی طرف تھا۔ وہ سمجھ گئی۔

"آپ نے سوچ لیا ہو گا کہ میں ماڈاسکواڈ سی لڑکی ہوں۔ مگر ایسا نہیں ہے میں اس سب کو اچھا نہیں سمجھتی۔ تین سال پہلے میں نے حج کیا' تو وہیں سے ہی میری سوچ میں تبدیلی آئی ورنہ اس سے پہلے میں بھی عام لڑکیوں کی طرح تھی بہرحال اب ایسا نہیں ہے۔"

"رانیہ! مجھے یقین ہے آپ بہت خوبصورت ہیں' کیا مجھے اپنا چہرہ دکھائیں گی۔ اس نے موہوم سی امید کے سہارے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس نہیں کا مطلب نہیں ہوتا ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"مگر ہم اچھے دوست ہیں' کیا اس ناتے سے میرا حق نہیں بنتا کہ میں آپ کو دیکھ سکوں؟"

"نہیں' مجھے وہی دیکھے گا جو مجھے دیکھنے کا حق رکھتا ہو گا۔ میری تمام خوبصورتی صرف ایک شخص کے لیے ہے' جو میرا مجازی خدا ہو گا۔" اس کا لہجہ کھرا اور دو ٹوک تھا۔

فراز کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ وہی ہے جس کی اسے تلاش ہے۔ وہی مضبوط کردار کی پُر اعتماد سی لائف پارٹنر جس کے اس نے خواب دیکھے تھے جو اس کی آئندہ آنے والی نسلوں کو سنوار سکے۔

جب اس نے اپنی مما سے رانیہ کے بارے میں بات کی تو انہوں نے مثبت رائے ظاہر کی۔ اسی وقت بازار جا کر ایک خوبصورت سی گولڈ رنگ خرید لایا۔ اس کا ارادہ تھا کہ مما کے بات کرنے سے پہلے ہی تجدید محبت کے طور پہ' یہ انگوٹھی رانیہ کو پیش کرے گا۔

☼ ☼ ☼

فراز اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"میری مما آپ کے گھر آنا چاہتی ہیں؟" وہ کوٹ کی جیب سے انگوٹھی نکال چکا تھا۔

"وہ کس لیے؟"

"رانیہ! آئی لو یو۔" جذبات کی شدت سے اس کا لہجہ لرز رہا تھا۔ "مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے' میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ انگوٹھی پہن کر میری محبت قبول کر لیں۔"

"مگر یہ ناممکن ہے۔"

"وہ کیوں۔"

"اس لیے کہ میرا نکاح ہو چکا ہے' چار ماہ بعد رخصتی ہے۔"

"آپ نے بتایا کیوں نہیں' شروع سے مجھے بتا دیتیں تو میں اتنا آگے نہ بڑھتا۔" اس کے لہجے میں وحشت سی تھی بالکل ویسی جو وہ حرا میں بھی دیکھ چکی تھی۔

"آپ کیوں آگے بڑھے' کیا میں نے آپ کے ساتھ محبت کے وعدے کیے تھے؟" وہ بڑے آرام سے اسے آئینہ دکھا رہی تھی۔

"پھر وہ سب کیا تھا؟ میری معنی خیز باتوں پہ شرما جانا' مجھ سے ملنے کے لیے آنا' چار چار گھنٹے مجھ سے بات کرنا۔ کیا تھا وہ سب؟" وہ چلا اٹھا۔

"آپ نے خود مجھ سے دوستی کی تھی اور ہم صرف اچھے دوست ہیں۔ آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات نہ کیجیے گا۔ میں آج سب کچھ یہیں ختم کر رہی ہوں۔" پھر وہ اس کے سامنے نپے تلے قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

فراز ساکت سا بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ تھکے تھکے قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"ہم صرف اچھے دوست ہیں۔"

اس کا اپنا ہی کہا ہوا جملہ آج اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

❄

نبیلہ ابر راجہ

ازل اس گھر کی پہلی اولاد تھا۔ وہ سولہ سال کا تھا جب سب سے چھوٹے چچا کے گھر بارہ طویل سالوں کے بعد پہلی اور آخری اولاد نے جنم لیا۔ مبشر اور طیبہ کی خوشیوں کا ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ بڑے بھائی یعنی ازل کے والد نے بچے کے کان میں اذان دی۔ دادی' دادا' تایا' چچا' پھوپھو سب بے پناہ خوش تھے۔

لقمان شاہ کو چھوٹے بیٹے سے ازحد محبت تھی۔ مبشر کئی سال سے اولاد کے لیے ترس رہا تھا۔ اب سوکھے دھانوں پر پانی پڑا تھا۔

ازل کالج سے لوٹا تو ماحول بڑا غیر معمولی سا لگ رہا تھا۔ دیگوں کے پکوان کی مخصوص خوشبو اس کی ناک سے ٹکرائی۔ لان میں پھٹے پرانے کپڑوں اور مفلوک الحال چہروں والے کئی لوگ جمع تھے۔ سائیڈ پر چھ سات بکرے ذبح ہوئے پڑے تھے۔ چھوٹے چچا ان لوگوں میں پیسے بانٹ رہے تھے۔ دادی جان بار بار سرمستی کے عالم میں اندر باہر آجا رہی تھیں۔ اس کا حیران ہونا فطری امر تھا۔ فائل پھینک کر وہ چچا اور دادی کے پاس چلا آیا اور اس رونق کا سبب پوچھا۔ جاننے پر اسے بھی بے حد خوشی ہوئی۔ وہ فوراً" چچی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر سب عورتیں جمع تھیں۔ وہ دروازے پر رک سا گیا۔ ماں کی نظر پڑی تو انہوں نے اسے بلا لیا۔ نپے تلے قدم رکھتا وہ اندر آگیا۔

چچی لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے زرد زرد چہرے پر الوہی سی چمک تھی۔ ساتھ بے بی کارٹ میں وہ ننھی منی سی گڑیا آنکھیں بند کیے سوئی ہوئی تھی۔ ازل نے بے بی کارٹ کے اوپر سے جھک کر اس کے گلابی گلابی رخسار چھوئے تو اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کی مدھم سی لکیر ابھری۔

"مما دیکھیں یہ ہنس رہی ہے۔" ازل نے بچوں کی سی خوشی سے عظمیٰ کو بتایا تو کمرے میں موجود سب عورتیں ہنس پڑیں۔

مبشر آج غریبوں کے لیے گھر میں کھانا پکوا رہے تھے۔ کل رات سب خاندان والوں کی دعوت تھی۔ ساتویں دن بڑے دھوم دھام سے بچی کا عقیقہ کیا گیا اور نام رکھنے کا مرحلہ آیا۔ ازل نے کہا کہ "اس کا نام امید رکھیں گے۔" سب ہی کو یہ نام پسند آیا کیونکہ یہ بچی واقعی ماں باپ کے لیے امید ہی تو تھی۔

کالج سے آکر ازل کا زیادہ تر وقت امید کی نذر ہوتا تھا۔ جب اس کی بانہوں کے سہارے امید نے پہلا قدم اٹھایا تو اس نے اپنی مہینے بھر کی پاکٹ منی چپکے سے خیرات کر دی۔ توتلی زبان میں امید نے سب سے پہلے ازل ہی کو پکارا۔

امید کی قسمت میں ماں باپ کی محبت نہیں تھی۔ ڈھائی سال بعد ہی طیبہ اور مبشر شاپنگ پر جاتے ہوئے روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر مارے گئے۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ معصوم بچی کو کچھ ہوش نہیں تھا اس نے کچھ روز تو ماں باپ کو ڈھونڈا پھر ناکام ہو کر تائی کے دامن میں دبک گئی۔ عظمیٰ بیگم نے از خود اسے اپنی ذمہ داری بنا لیا۔

ازل اکیڈمی سے آتے ہی اسے گھمانے لے جاتا۔ وہ بہت ذہین بچی تھی۔ ساڑھے تین سال کا ہوتے ہی فواد یعنی تایا نے اسے اسکول داخل کرا دیا۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی جا رہی تھی' ازل کے ساتھ اس کی محبت میں شدت آتی جا رہی تھی۔ وہ اسے ایک منٹ کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ اسے

مکمل ناول

سکون سے پڑھائی بھی نہیں کرنے دیتی تھی۔ ایسے میں ازل اسے بڑی مشکل سے بہلاتا۔ گھر میں شام کو حافظ صاحب امید کو دینی تعلیم دینے آتے۔

آہستہ آہستہ وقت گزر رہا تھا۔

بڑی پھوپھو کی بیٹی نیرا کی شادی تھی۔ بجی سنوری اسٹیج پر ضیاء کے پہلو میں بیٹھی وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ امید بڑے اشتیاق سے چھوچھو کر نیرا آپی کو دیکھ رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ دولہن کے ساتھ امید کی بھی ایک تصویر بنواؤ' بس پھر کیا تھا امید مچل گئی کہ مجھے بھی دولہن بننا ہے۔ سب اس کی معصوم سی فرمائش پر ہنس دیے۔ شادی سے واپس آکر اس نے یہی رٹ لگائے رکھی کہ مجھے دولہن بننا ہے۔ ایک ہفتے بعد اس کی رسم بسم اللہ تھی۔ اس نے تقریباً" سات برس کی عمر میں قرآن شریف پڑھ لیا تھا۔ بڑے پیمانے پر اس تقریب

کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

بڑی چچی نے اسے ریڈ کلر کی پشواز، چوڑی دار پائجامہ پہنایا، ہاتھوں میں بھر بھر چوڑیاں پہنائیں، چھن چھن پازیب چھنکاتی امید نے خود کو آئینے میں دیکھا تو جھٹ دولہن بنی نیرا آپی اس کے تصور میں آگئیں۔ اس نے وہیں زور زور سے رونا شروع کردیا۔

"مجھے دولہن بننا ہے نیرا آپی کی طرح۔"

سب اسے بڑی مشکل سے چمکار کر لائے۔ وہ کسی طرح چپ ہونے میں ہی نہیں آرہی تھی۔ اقرا نے مذاق کیا۔

"کس کی دولہن بنو گی۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر جھٹ بولی۔

"اتزل بھائی کی۔"

وہ ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی۔

"پر بھائی تو دولہا نہیں بنتے ناں۔" اقرا نے دلیل دی۔

"اچھا میں صرف اتزل کی دولہن بنوں گی۔" اس نے فوراً "بھائی" کا لفظ حذف کردیا۔ ساری محفل زعفران زار بن گئی پھر اس کی ضد پوری کرنے کے لیے اتزل کو دولہا بننا پڑا اور اصلی گلابوں کا ہار پہن کر اسٹیج پر امید کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں بھی بنوانا پڑیں۔ سارے کزنز اتزل کو چھیڑ رہے تھے۔ کیا برابر کی دولہن ڈھونڈی ہے۔ حقیقتاً وہ سب امید کی معصوم شرارتوں اور حرکتوں کو بڑا انجوائے کرتے تھے۔

تصویریں دھل کر آئیں تو امید بڑے فخر سے اپنی ٹیچرز کو دکھانے لے گئی کہ یہ میرا دولہا ہے۔ ینگ سے لڑکے کو اس کے دولہا کے روپ میں دیکھ کر وہ حیران تھیں۔

پیاری سی امید سب ٹیچر کی منظور نظر تھی۔ انہیں افسوس سا ہوا کہ اتنی چھوٹی بچی کا اتنی بڑی عمر کے لڑکے سے ناتا جڑا ہے۔ یوں ہی اس کی ایک ٹیچر پوچھنے کے لیے گھر چلی آئیں تو حقیقت جان کر اسے بے حد شرمندگی ہوئی۔ اتزل بری طرح ہنس جو رہا تھا بلکہ وہ سب ہی ہنس رہے تھے۔ ہاں امید سب کو دیکھے جارہی تھی۔ اس رات وہ اپنا بھالو اٹھائے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

"اب میں آپ کے پاس رہوں گی کیونکہ نیرا آپی بھی اپنے دولہا کے پاس رہتی ہیں۔"

وہ داد طلب نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اتزل نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبالی۔ جب کہانی سنتے سنتے وہ اس کے سینے پر سر رکھے سوگئی تو وہ اسے اس کے بیڈروم میں چھوڑ آیا۔

پہلے وہ پریوں اور شہزادوں والی کہانیاں سنتی تھی اب وہ مار دھاڑ والی کہانیوں کی فرمائش کرتی۔ آٹھویں سالگرہ پر اتزل نے اسے باربی ڈول لا کردی تو وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"مجھے گن چاہیے، ڈھشوں ڈھشوں والی۔"

اس نے منہ سے آواز نکالی تو وہ ان ہی قدموں لوٹ گیا اور اس کا کہا پورا کردیا۔

--*

اتزل اپنے دوست اخلاق کے ساتھ موٹر بائیک پر فرہاد کے گھر گیا ہوا تھا۔ واپسی پہ تیز بارش شروع ہوگئی سردیوں کا موسم تھا گھر پہنچنے تک وہ کھانسی اور چھینکوں کی زد میں تھا۔ کلثومی نے فوراً "ڈاکٹر کو فون کردیا اور امید تو اس کے سرہانے ہی بیٹھ گئی۔ کبھی ننھے منے ہاتھوں سے اس کا سر دباتی، کبھی ماتھے پر ہاتھ رکھتی اور بڑی معصومیت سے اس سے پوچھتی۔

"اتزل آپ کب ٹھیک ہوں گے۔" جب سے اقرا نے اسے کہا تھا کہ دولہا کو بھائی نہیں کہتے تب سے اس کی زبان پر اتزل چڑھا ہوا تھا۔ رات اس نے تائی کے ہاتھ سے سوپ لے کر ضد کی کہ میں پلاؤں گی۔ اناڑی پن کی وجہ سے پیالہ اس کے ہاتھوں سے چھلک گیا تھا اور اتزل کا سینہ و گردن جھلس گیا۔

وہ اب بھی اس سے رات کو کہانی سنے بغیر نہیں سوتی تھی۔ اسے سنانے کے لیے اتزل کو بچوں کا ادب بھی پڑھنا پڑتا، اسے بچوں کے جاسوسی ناول بہت پسند تھے۔ اتزل رات کو پڑھ پڑھ کر سناتا اور وہ اس کے سینے میں سر گھسائے ہمہ تن گوش ہوتی۔ اب وہ اکثر اس کا کام بھی کرنے کی کوشش کرتی۔ وارڈروب سے اس کے کپڑے اسٹول رکھ کر اتار لاتی، اس کے چپل پاؤں

کے پاس رکھتی، پانی لا دیتی، سر دبا دیتی اور تو اور اس کے بالوں میں ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر چڑھ کر کنگھی بھی کرنے کی کوشش کرتی۔

اس کی دسویں سالگرہ سے پہلے ہی اتزل سی ایس ایس کا ایگزام کلیئر کرنے کے بعد ٹریننگ کے لیے شہر سے باہر چلا گیا تو پہلے دن ہی وہ گھبرا گئی۔ رات کو اسے خوف کے مارے نیند ہی نہیں آئی۔ تائی نے حتی الامکان کوششیں کی کہ وہ بہل جائے۔ اتزل سے چھوٹے تیمور نے کئی لالچ دیے، پر وہ کسی کے قابو میں ہی نہیں آئی۔ ہاں اتزل ہر دوسرے روز وقت نکال کر فون ضرور کرتا اور اسے کہتا کہ کسی کو تنگ نہ کرنا، رونا نہیں، خوب دل لگا کر پڑھنا ورنہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ اس کی نہ آنے والی بات سن کر وہ اس کی ساری ہدایات پر عمل کرتی پھر ٹریننگ کے بعد وہ صرف ایک ہفتے کے لیے آیا تھا۔ اس کی پوسٹنگ بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر شیخوپورہ ہوگئی تھی۔

سب ہی اداس تھے۔ تائی اور تایا بھی اداسی چھپا کر مسکرا رہے تھے۔ امید کو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ جارہا ہے۔ ہاں اس کی وجہ سے اتزل اداس تھا۔ امید کے محبت بھرے معصوم وجود کا وہ اتنا عادی ہوچکا تھا کہ دوری کا تصور ہی سوہان روح تھا۔ وہ اس کی واپسی سے ہواؤں میں اڑی پھر رہی تھی۔ رات گئے تک کہانی سننے کے بعد بھی اس کی جان نہ چھوڑتی۔

اتزل کی روانگی میں ایک روز باقی تھا تو وہ اسے بازار لے گیا۔ دل بھر کر شاپنگ کرائی، اس کی پسندیدہ اسٹوری بکس لے کر دی، نت نئے ڈیزائن کے فراکس اور شوز خریدے، ڈھیروں چاکلیٹس لیں۔ رات ہمیشہ کی طرح کہانی سنانے کے بعد اتزل نے مناسب الفاظ میں اسے اپنی روانگی کا بتایا۔ وہ سنتے سے ہی اکھڑ گئی۔

"مجھے کہانیاں کون سنائے گا، پارک کون لے کر جائے گا، پڑھائے گا کون، کھیلے گا کون میرے ساتھ۔" اس طرح کے ڈھیروں سوال اس کی زبان پر تھے۔

"تیمور ہے اقرا، راحت، عدی، اور مون ہے۔ امبرین، طیب ہے۔ سب تمہارے ساتھ کھیلیں گے، کہانیاں سنائیں گے، پارک بھی لے جائیں اور تمہیں پتا ہے سب جلتے ہیں مجھ سے کہ میں نے تمہیں ہتھیا لیا ہے۔ گرینڈپا کو بھی یہی شکوہ ہے۔" اتزل نے اس کی چھوٹی سی پونی کو چھیڑا۔ ملازم نے اس کا تمام سامان گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ امید کو پتا چل گیا کہ وہ جانے والا ہے حالانکہ تیمور نے کتنا کہا تھا۔ "آؤ تمہیں گھما لاؤں" پر وہ نہیں گئی۔ اب جب وہ سب سے مل کر اس کے پاس آیا اور ہمیشہ کی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کی پیشانی چومی تو وہ زور زور سے رونے لگی۔

"میں بھی ساتھ جاؤں گی، میں بھی ساتھ جاؤں گی۔" وہ اس کے کوٹ کو مضبوطی سے تھامے پاؤں زمین پر مار رہی تھی۔

"دیکھو جانو تم جب بھی بلاؤ گی، میں آجاؤں گا یوں۔" اتزل نے چٹکی بجائی۔

"جادوگر شہزادے کی طرح۔" امید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں۔"

"پھر مجھے اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ دیں ناں میں جب اداس ہوجاؤں گی تو آپ کو بلایا کروں گی۔"

اس کی قدرے تسلی ہوگئی اتزل نے جاتے جاتے اپنے بالوں کی ایک لٹ اسے کاٹ کر تھمادی جب تک اس کی گاڑی نظر آتی رہی وہ ہاتھ ہلاتی رہی۔

بڑوں نے فیصلہ کیا کہ امید کی شدت پسندی ختم کرنے کے لیے اسے بورڈنگ میں داخل کروا دیتے ہیں اتزل کو بھی روز روز فون کرنے سے منع کردیا اسے دل پہ پتھر رکھنا پڑا یوں بھی نئی نئی نوکری کے بکھیڑے تھے وہ از حد مصروف ہوتا تھا۔ امید بورڈنگ سدھار گئی بہت سے جھوٹ اور لالچ کے بعد وہ بورڈنگ جانے پر راضی ہوئی جس میں اتزل سے ملنے کا لالچ سر فہرست تھا۔

ایک دو تین پورے چار سال گزر گئے امید اب سینئر کیمبرج میں آگئی تھی گزرتے چار سالوں کے دوران اس نے جادوگر شہزادے کا عمل کرکے کتنی بار اتزل کو بلانا چاہا تھا پر وہ نہیں آیا تھا آہستہ آہستہ اسے

احساس ہو گیا تھا کہ وہ محض بہلاوا تھا تسلی تھی چھٹیوں میں وہ جب بھی گھر جاتی تو ازل سے اس کی ملاقات نہیں ہو پاتی بھی پورے چار سال گزر گئے اسے ازل کو دیکھے ملے اور باتیں کیے ہوئے وہ بے پناہ باشعور ہو گئی تھی بچپن کی حماقتیں اس کے رخساروں کو گلابی کر دیتی تھیں معصوم محبت کی جڑیں خودرو گھاس کی طرح اس کے وجود میں پھیل گئی تھیں جب بھی اس کا جی گھبراتا وہ کتاب سے جھٹ اس کی اور اپنی تصویر نکال لیتی جو رسم بسم اللہ کے موقعے پر لی گئی تھی امید نے اتنی بار وہ تصویر دیکھی تھی کہ اسے ازل کے چہرے کا ایک ایک نقش ازبر ہو چکا تھا اس کے بالوں کی لٹ جوں کی توں اس کے پاس پڑی ہوئی تھی۔

سینئر کیمبرج کے ایگزام آخر ختم ہو گئے تو مری سے اس کا دانہ پانی بھی ختم ہو گیا عدی اسے لینے آیا تو بات بات پہ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھلکی پڑ رہی تھی گھر پہنچ کر یہ راز کھل گیا گرینڈ پا سے لے کر مون تک سب اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ وہ بے تابی سے گرینڈ پا سے چمٹ گئی تائی کو بڑے لاڈ سے پیار کیا تایا پھوپھو سب سے محبت سے ملی سامان رکھ کر وہ نہانے چلی گئی افزا رومیزہ راحت صباحت سب اس کے کمرے میں جمع تھیں وہ نہا کر نکلی تو اقراء نے ایک دم اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔

"ذرا یہ بیک سائیڈ دیکھ کر بتاؤ کہ یہ کون ہیں۔"

اس نے ہاتھ ہٹاتے ہی پوچھا سامنے کرسی پر رخ موڑے کوئی بیٹھا ہوا تھا چوڑے کندھے ورزشی کمر بالوں کا مخصوص اسٹائل وہ لاکھوں میں بھی باآسانی شناخت کر سکتی تھی۔

"ازل" اس کی خوشی سے بھرپور آواز نکلی۔

"جی آپ کے بچپن کے دولہا" راحت نے ٹکڑا لگایا ازل گھوم گیا امید نے بے تابی سے اپنا بازو اقرا کی گرفت سے چھڑایا مگر پھر اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے وہ کوئی معصوم سی بچی تو نہیں رہی تھی کہ اس کے گلے میں جھول جاتی۔

"ارے واہ امید اتنی بڑی ہو گئی ہے۔" وہ اس کے قریب آ کر گویا ہوا اور اسے پرشوق نگاہوں سے دیکھا

امید نے نگاہیں اٹھائیں وہ پہلے سے بھی بڑھ کر مضبوط و صحت مند لگ رہا تھا وہ اس کا حال چال پوچھ رہا تھا وہ بس ہوں ہاں کیے جا رہی تھی ہمیشہ کی طرح پٹر پٹر کرنے والی زبان گویا آج اس کے سامنے تھک گئی تھی۔

رات کو جب سب اٹھ گئے تو وہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔

"پتہ ہے میں اب ادھر ہی پوسٹڈ ہوں چار روز ہو گئے ہیں مجھے آئے ہوئے عدی نے کہا تھا کہ میں امید کو سرپرائز دوں گا میں سوچ رہا تھا تم بہت سخت ناراض ہو گی میرے تصور میں تو وہی دس گیارہ سال کی امید بسی ہوئی تھی جو پاؤں پٹخ پٹخ کر روتی تھی اسی حساب سے میں تمہارے لیے گفٹس لایا ہوں یہ دیکھو۔" ازل نے ہاتھ میں تھاما بیگ آگے کیا۔ چھ عدد قیمتی فراکس تھیں جدید ساخت کی نقلی گن کہانیوں کی کتابیں سوئیٹس چاکلیٹس اور نہ جانے کیا کیا الا بلا وہ دونوں ہی ہنس دیے۔

"میں اب فراک نہیں پہنتی اس گن سے بھی دلچسپی نہیں ہے اور ہاں اب میں بچکانہ ادب نہیں پڑھتی۔" امید نے تمام چیزیں واپس شاپر میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"صبح میرے ساتھ لبرٹی چلنا اپنی پسند کی چیزیں خرید لینا۔"

"آپ کی برتھ ڈے پر میں جو ہر سال گفٹس بھیجتی رہی ہوں آپ کو مل جاتے تھے ناں۔"

"ہاں وہ بچوں کی سیریز عمران سیریز اور چاکلیٹس مجھے ملتی رہی ہیں بلکہ کچھ تو میرے پاس ابھی بھی پڑی ہوئی ہیں۔" وہ ہنسا۔

رات کتنی دیر تک وہ اس سے باتیں کرتا رہا ڈھائی بج رہے تھے ازل ہی کو دھیان آیا تو وہ اٹھا۔

"شب بخیر۔" واپس آتے آتے وہ چونک کر باہر نکل گیا امید نے دروازہ لاک کیا آج سے پہلے ہمیشہ ازل ہی اسے اٹھا کر اس کے بیڈ روم میں چھوڑ کر جاتا تھا اس کے جوتے اتارتا تکیہ درست کرتا اور ماتھے پر پیار کر کے لائیٹ آف کر دیتا بارش اور آندھی سے وہ خاصی خوفزدہ رہتی تھی ایسے موسم میں اسی کے ساتھ

سوتی وہ ہر ممکن طریقے سے اس کا ڈر دور کرنے کی کوشش کرتا امید کے سارے خوف اس کے سینے سے لگتے ہی غائب ہو جاتے تھے۔

باشعور ہوتے ہی امید کے جذبوں نے رنگ بدل لیا تھا چاہت کی دھیمی دھیمی چنگاری اسے خاک کر رہی تھی آج اسے دیکھتے ہی احساسات نے اور بھی زور پکڑ لیا تھا۔

عظمیٰ اب ازل پر شادی کے لیے زور دے رہی تھیں خیر سے وہ لائق و ہونہار ڈی سی تھا شکل و صورت اور خاندان میں بھی اپنی مثال آپ تھا اس کی۔ "ابھی نہیں ابھی نہیں" کی وجہ سے انہوں نے تیمور اور صباحت کی بھی شادی دو سال ہوئے کر دی تھی افزا اور راحت بھی شادی شدہ تھیں اکتیس سال کا ہونے کے باوجود وہ چھڑا چھانٹ تھا ان کے دباؤ سے گھبرا کر اس نے اقرار کر لیا کہ وہ لڑکی پسند کر چکا ہے۔

روشان اس کے کولیگ کی بہن تھی دو سال پہلے ہاسپٹل میں ازل کی اس سے ملاقات ہوئی معمولی سا ایکسیڈنٹ تھا وہ نئی نئی ہاؤس جاب کے لیے آئی تھی ازل کے دل کو پہلی نگاہ ہی میں اس نے شکار کر لیا تھا پھر ان کی ڈھیروں ملاقاتیں ہوئیں بات شادی کے وعدے پر تمام ہوئی اس نے کہا کہ گھر جانے کے "تقریباً" ایک سال بعد وہ رشتہ لے کر آئے اس میں جانے روشان کی کیا مصلحت تھی اس نے اس کا کہا مان لیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

کارڈز کھیلتے ہوئے امید مسلسل بے ایمانی کر رہی تھی اس کے باوجود بھی ہار رہی تھی اس لیے تنگ آ کر کھیل ختم کرنے کا اعلان کیا ازل نے اٹھتی امید کا بازو جھٹکے سے پکڑ کر کھینچا وہ اس کے اوپر گرتے گرتے بچی۔

"بری بات ہے اچھے بچے بے ایمانی نہیں کرتے۔" ازل نے ہنوز اس کا بازو تھاما ہوا تھا ازل کی مضبوط مردانہ گرفت میں اس کی کلائی کمزور ہو گئی۔

"اچھا اب نہیں کروں گی۔" اس کی نگاہیں جھک گئی تھیں اس کی گرفت سے امید کو اپنے اندر کرنٹ

سا دوڑتا محسوس ہوا پھر کھیل میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی ایک مضبوط ہاتھ کا لمس توجہ تقسیم کر رہا تھا۔

اس روز وہ آفس سے لوٹا تو معلوم ہوا کہ امید کو ٹمپریچر ہے اور وہ دوا کھانے سے مسلسل انکار کر رہی ہے سب نے اس کی منتیں کر کے دیکھ لی تھیں اس نے تمام سیرپ کیپسول اور گولیاں ہاتھ مار کر ٹیبل سے گرا دی تھیں بس روئے جا رہی تھی۔ ازل کو دیکھ کر عظمیٰ نے سکون کا سانس لیا۔

"تم اسے جا کر دوا تو کھلا دو تمہاری ہر بات مانتی ہے اتنا تیز بخار ہے تمام جسم تنور کی طرح تپ رہا ہے گلا بھی خراب ہے کل جو ڈھیروں آئسکریم کھائی ہے ناں اسی کا نتیجہ ہے جلدی سے کپڑے تبدیل کرو اور اسے دیکھو انجکشن بھی نہیں لگوا رہی ہے۔"

وہ جلدی جلدی بول رہی تھیں اس نے فوراً کپڑے تبدیل کر کے اس کے کمرے کا رخ کیا تھک ہار کر سب جا چکے تھے وہ اکیلی آنکھوں پر بازو رکھے سسک رہی تھی۔

"امید جانو کیوں تنگ کر رہی ہو تمہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے جو دکھ ہوتا ہے اس کا احساس ہے کچھ۔" ازل نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے زبردستی آنکھوں سے اس کا بازو ہٹایا واقعی وہ تنور کی طرح تپ رہی تھی۔

"اٹھو شاباش دوا پی لو۔" وہ ٹیبل سے دوائیں اٹھا کر دیکھنے لگا وہ یونہی پڑی رہی۔

"اٹھو بابا۔" ازل نے اسے شانوں سے تھام کر اٹھا دیا۔

"نہیں پیوں گی۔" وہ ضدی ہو گئی۔

"کیوں نہیں پیو گی میں دیکھتا ہوں کیسے نہیں پیتی ہو بچپن میں بھی تم یہی کرتی تھیں میں آج بھی لحاظ نہیں کروں گا۔" پھر چمچ اس نے دوا پیالی میں ڈالی دونوں کلائیاں مضبوطی سے ایک ہاتھ میں تھام کر زبردستی پیالی اس کے منہ سے لگائی اس کے اندر حشر برپا ہو گیا اس نے جلدی جلدی ساری دوا پی لی۔

"اب آپ جائیں۔" اس کے معصوم سے ضبط کے پرخچے اڑ گئے۔

www.paksociety.com

"کیوں جاؤں میں ساری رات ادھر ہی بیٹھا رہا ہوں گا ابھی دو خوراکیں رہتی ہیں چار چار گھنٹے بعد لینی ہیں دے کر ہی جاؤں گا بے شک صبح مجھے چھٹی کرنی پڑی مجھے ہنستی مسکراتی فریش فریش سی امید چاہیے دیکھو تو کتنی گرم ہو رہی ہو ابھی تک وہی بچپنا ہے خیر تمہارا بھی قصور نہیں ہے عمر بھی کیا ہے تمہاری پھر رہی سہی کسر میں نے تمہارے لاڈ اٹھا اٹھا کر پوری کر دی ہے۔" وہ دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ سہلا رہا تھا امید کو سب خواب لگ رہا تھا اتزل اور اس کے اتنے قریب اسے نہ جانے کیا احساس ہوا کہ پھر رونا شروع ہو گئی۔

"میں بھی مما پاپا کی طرح جلدی مر جاؤں گی ناں۔"

"ڈونٹ بی سلی میں تمہیں مرنے دوں گا بھلا۔"

اتزل نے اسے خود سے قریب کر لیا تھا آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو گئی اتزل کا ایک بازو اس کی کمر کے گرد حمائل تھا اور دوسرا اس کا سر سہلا رہا تھا وہ فوراً اس کے حصار سے نکلی۔

"آئی سویئر میں دوا کھا لوں گی آپ جائیں۔" وہ سرک کر کنارے پر ہو گئی۔

"بے ایمانی نہیں چلے گی میں رات کو آ کر چیک کروں گا۔" اتزل نے وارننگ دی۔

"اگر تم یونہی میری تیمارداری کرتے رہے ناں تو مجھے قیامت تک ٹھیک نہیں ہونا۔" وہ دل میں بولی۔

اس کے جانے کے بعد وہ عجیب سے احساسات میں گھر گئی اس کی قربت اچھی بھی لگ رہی تھی اور ناگوار بھی چند منٹ بیشتر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی ضدی بچی بنی رہے اور وہ زبردستی اسے دوا پلاتا رہے کتنی جلدی وہ اس کے آگے ہار گئی تھی۔ اپنے وعدے کے مطابق وہ پورے بارہ بجے پھر آیا تھا اب کی بار امید نے خود دوا لی تھی۔

"ڈر تو نہیں لگے گا ناں اگر ایسی بات ہے تو میں ادھر ہی بیٹھ جاتا ہوں تم آرام سے سوؤ۔"

"نہیں، نہیں میں نہیں ڈرتی اب آپ جائیں مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ کمبل تان کر لیٹ گئی۔

*_*_*

کالج میں ایڈمیشن لیتے وقت امید نے اتزل کے مشورے پر مضامین منتخب کیے تھے اسے کالج پک اینڈ ڈراپ کرنا عدی کی ذمہ داری تھی صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے وہ اسے بخوشی چھوڑ جاتا تھا ہاں واپسی پر گیٹ کے آگے اسے بڑے صبر و سکون سے امید کا انتظار کرنا پڑتا تھا وہ سہیلیوں سے اچھی طرح مل ملا کر آتی تھی عدی کا پارہ ہائی ہو تا تھا دو ماہ میں ہی وہ تنگ آ گیا اب یہ کرتا کہ صبح ناشتے کے فوراً بعد بھاگ نکلتا وہ منہ دیکھتی رہ جاتی تنگ آ کر اتزل سے شکایت کی۔

"میں تمہیں کالج چھوڑ دیا کروں گا اور لنچ بریک میں لے آیا کروں گا۔"

صبح اسے جلدی اٹھنا پڑتا تھا امید آٹھ بجے کالج جاتی تھی جبکہ وہ خود نو ساڑھے نو بجے آفس کے لیے نکلتا تھا۔ آج وہ اذانوں کے آدھے گھنٹے بعد بیدار ہوئی جلدی جلدی نماز پڑھی اور گیٹ کی طرف آئی ہاکر نے اخبار پھینک گیا تھا وہ برآمدے ہی میں بیٹھ کر سرخیاں دیکھنے لگی سامنے لان میں اتزل ایکسرسائز کر رہا تھا ہلکی پھلکی ورزش کے بعد وہ جم چلا جاتا تھا جہاں سے اس کی واپسی پون گھنٹے بعد ہوتی تھی گھر سے جمنازیم تک جاگنگ کرتا ہوا جاتا تھا اس نے خود کو اتنا فریش اور فٹ رکھا ہوا تھا کہ اس کے جسم پر گوشت کی فالتو بوٹی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی لڑکے اس کی فٹ نس پر رشک کرتے اور لڑکیاں آہیں بھرتی تھیں۔

ایکسرسائز کا سلسلہ موقوف کر کے اتزل نے برآمدے میں بیٹھی امید کو آواز دی۔

"جی۔" وہ اخبار تہہ کرتی چلی آئی۔

"میں آٹھ بجنے سے پانچ منٹ پہلے آؤں گا تیار رہنا۔" اسے یاد دہانی کروا کر وہ پنجوں کے بل دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کی ہدایت پر وہ فوراً تیار ہوئی تھی۔

وہ مقررہ وقت پر واپس آ گیا اسلم نے جوس کا گلاس اسے تھمایا۔

"امید جاؤ میرے کمرے سے بھاگ کر گاڑی کی چابی لے آؤ۔" وہ گلاس اٹھاتا ہوا بولا۔ وہ سرکاری گاڑی میں اسے چھوڑنے جا رہا تھا راستے میں ٹریفک

کانسٹیبل سلام جھاڑ رہے تھے۔ جیسے ہی اس کی گاڑی گیٹ کے آگے رکی دوسری طرف سے عشعی چودھری کی گاڑی آتی دکھائی دی اس نے بڑی حیرت سے امید کو دیکھا اور ساتھ بیٹھے اتزل کو دیکھا گیٹ پر ہی اسے ثمیہ مل گئی ان کے آگے آگے امید چل رہی تھی۔

"ارے دیکھا ڈی سی اتزل شاہ کو امید مبشر کو ابھی ابھی ڈراپ کر کے گیا ہے۔"

اتزل کے نام پر امید کے کان کھڑے ہو گئے عشعی چودھری یونین کی صدر تھی برگر کلاس سے تعلق رکھتی تھی بڑی بے باک اور آزاد خیال لڑکی تھی۔

"ہاں تمہیں نہیں گھاس ڈالنے والا' دو ماہ سے کلب جا رہی ہو صبح نیند کی قربانی دے کر جمنازیم جاتی ہوں ایک نظر بھی نہیں دیکھا ہے اس نے کبھی' بڑا پراؤڈ ہے چھوڑو اس کا خیال" ثمیہ نے اسے جھاڑا۔

امید کالج کی پاپولر گرل بن گئی تھی نصابی سرگرمیوں کے ساتھ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش تھی گزشتہ دنوں شاعری کے بین الصوبائی مقابلے میں اس کی وجہ سے کالج نے ٹرافی جیتی تھی پورے چھ سال بعد دوبارا کالج کو یہ اعزاز ملا تھا فائن آرٹس کی ٹیچر بھی اس سے بہت خوش تھی عشعی چوہدری بھی فائن آرٹس کی کلاسز اٹینڈ کرتی تھی امید کے بنائے ہوئے لینڈ اسکیپ نے اسے چونکا دیا تھا یوں اس کی اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ یونین کی صدر تھی اکثر اسے کام پڑ جاتے تھے۔

عشعی کی بات نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا تھا اسے بھی علم تھا کہ وہ ان کے آگے چل رہی ہے اس کے یوں گھومنے پر وہ دونوں مسکرائیں۔

"یہ جو ڈیشنگ و ہینڈسم سا مغرور بندا تمہیں ڈراپ کر کے گیا ہے تمہارا کیا لگتا ہے۔" عشعی نے بڑے آرام سے پوچھا۔

"میرے کزن ہیں۔" وہ بیگ دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہوئے اپنی ناگواری چھپا گئی۔

"امید اپنے کزن سے میری دوستی کروا دو ناں پچی اتنا پراؤڈ آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا روز کلب میں سوئمنگ کرنے آتا ہے اس کی وجہ سے میں نے بھی وہاں کی ممبر شپ حاصل کی ہے خود ہی ہیلو ہائے کرتی ہوں مگر وہ زیادہ بات ہی نہیں کرتا ہے۔" عشعی نے اپنا دکھڑا سنایا۔

"وہ تو آپ سے اتنے بڑے ہیں آپ کسی اور لڑکے سے دوستی کر لیں ناں۔" امید نے بپھرے دریا پر بند باندھنے کی ناکام کوششیں کیں۔

"سوئیٹی دوستی میں عمر کیا دیکھنی میں ٹوئنٹی کی ہوں تمہارے کزن زیادہ سے زیادہ تھرٹی کے لگتے ہیں مجھے اچھے لگے اس لیے کہہ رہی ہوں۔" وہ جیسے اس کی بیوقوفی پر ہنسی۔

"اچھا میری کلاس ہونے والی ہے۔" وہ جان چھڑا کر کوریڈور کی طرف بھاگ گئی اس روز اس نے جان کر فائن آرٹس کی کلاس مس کر دی اور عشعی سے چھپتی پھری۔ اتزل اسے لینے آیا تو اس نے "جلدی گاڑی ٹرن کریں" کا شور مچا دیا۔

اگلے دو روز وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے کالج ہی نہیں گئی۔ تیسرے روز تو عشعی نے اسے پکڑ ہی لیا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"مزے کی بات بتاؤں کل میرے انکل کے گھر ڈنر تھا انکل ستار ڈپٹی میئر ہیں ڈنر میں تمہارے کزن اتزل بھی آئے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر حیران ہوئے خاصی دیر بات بھی کرتے رہے اور مجھے اپنا کونٹیکٹ نمبر بھی دیا اب ثمیہ شرط ہار گئی ہے مجھے پی سی میں ٹریٹ دے گی کہہ رہی تھی تجھ سے تو وہ بات ہی نہیں کرے گا۔"

عشعی تفاخر سے بولی تو امید کا چہرا دھواں دھواں ہو گیا وہ کتنی بھرپور اور بے باک سی لڑکی تھی انگ انگ میں جیسے شرارے بھرے رہتے تھے اس کے کئی لڑکوں سے افیئر تھے وہ ہر ایک سے ملتی تھی ان کی کلاس میں یہ باتیں معیوب نہیں تھیں اتزل سے رسم و راہ بھی شاید اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

اور پھر امید اتزل کی سالگرہ پر عشعی اور اس کے بھائی کو شاہ ولا میں دیکھ کر حیران رہ گئی اس نے بڑا

بھڑکیلا سوٹ پہنا ہوا تھا میک اپ کے تمام ہتھیاروں سے آراستہ وہ واقعی بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔

امید سوچ میں پڑ گئی تھی کہ کیا پہنے اوڑھنے کے معاملے میں اس نے کبھی سرگرمی نہیں دکھائی تھی پر آج وہ سوچ رہی تھی کہ اسے یہ روش ترک کرنی پڑے گی وہ اقرا کو بلا کر لے آئی کہ وہ مشورہ دے اسے کیا پہننا چاہیے۔

"تم جا کر نہاؤ میں تمہارے کپڑے وارڈروب سے نکالتی ہوں ویسے تائی نے ارتل بھائی کو پھانسنے کے لیے بڑی زبردست لڑکیوں کو ماؤں سمیت بلایا ہے۔" اقرا نے ہنستے ہوئے اسے اطلاع دی تو وہ پریشان سی ہو گئی وہ اتنی چھوٹی سی ہے تائی کو کہاں نظر آئے گی انہیں اپنے وجود کا احساس دلانا چاہیے۔ وہ نہا کر نکلی تو اقرا اس کے کپڑے پریس کر کے جا چکی تھی۔ سفید آدھے بازوؤں والی شرٹ جس پر بلوچی کڑھائی کی گئی تھی بلیک شلوار اور ہم رنگ دوپٹہ تھا جس کے کناروں پر سفید چکن لیس لگی ہوئی تھی اقرا جوتے تک میچ کر کے رکھ گئی تھی راحت نے ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر دیا اس نے اس کے بالوں کو اونچا سا جوڑا بنا دیا سیدھی مانگ خوب سوٹ کر رہی تھی اپنی نازک گداز کلائیوں میں ڈھیروں کانچ کی چوڑیاں چڑھائے وہ بڑی بڑی لگ رہی تھی۔

باہر نکلتے ہی تائی اور تایا سے اس کا سامنا ہوا انعظمی نے بے اختیار اس کا ماتھا چوما اور اسی وقت اس کی نظر اتروائی۔ عدی نے اسے دیکھ کر بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کی یوں درباری مسخرے کی طرح آداب بجا لایا وہ روہانسی ہو گئی۔

ارتل اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کیک کٹنے کا وقت ہوا تو اس کی متلاشی نگاہیں امید کو تلاش کرنے لگیں راحت نے ہی اسے پکڑ کر آگے کیا آج تو وہ چھپتی پھر رہی تھی ارتل کو آج ایک دم سے وہ بڑی بڑی لگی۔

"یہ تم ہی ہو یا کوئی اور ہے ویسے نظر ضرور اتروا لینا ہو سکتا ہے میری ہی لگ جائے۔" وہ اسے چاہت سے دیکھ رہا تھا پیچھے کھڑی اقرا بے اختیار کھانسی تو امید کی گھنی پلکیں بے اختیار لرزیں وہ دوسری طرف متوجہ ہو چکا تھا اس کے دل میں پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی کیا اقرا اس کے دل کے چور سے آگاہ ہو گئی تھی۔

وہ چپکے سے ارتل کے لیے خرید اگیا گفٹ پیک اس کے کمرے میں رکھ آئی اسے روبرو دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کمرے میں آتے ہی ارتل کی نظر پہلے رکھے پھولوں کے بکے اور اس گفٹ پیک پر پڑی تھوڑی دیر قبل ہی کوریئر اسے روشان کی طرف سے بھیجا گیا گفٹ اور کارڈ دے کر گیا تھا اس نے بیتابی سے گیٹ پر ہی پیک کا ریپر پھاڑا تھا اس کا پسندیدہ پرفیوم اور پھول تھے لال سرخ گلاب۔ جو روشان کی طرف سے محبت کی شدت کو ظاہر کر رہے تھے۔

اس نے سوچتی نگاہوں سے وہ گفٹ پیک اٹھایا "امید مبشر" اس نے باہر لگے چھوٹے سے کارڈ پر اس کا نام پڑھا اور بڑی احتیاط سے کھولنے لگا محسن نقوی کی کتابوں کا سیٹ اس کا پسندیدہ پرفیوم اور پٹھانے خان کی کیسٹ تھی۔

"بہت خوب" اس نے کیسٹ اسٹیریو پر چڑھا کر کتابیں دیکھنی شروع کیں ہر کتاب پر اس کی خوب صورت رائٹنگ میں لکھا ہوا تھا "صرف آپ کے لیے۔"

وہ مسکرا دیا مبہم سی مسکراہٹ اور پھول دیکھنے لگا بیلے کے سفید اور مقدس پھول تھے اس نے اٹھ کر سرخ گلاب اور موتیے کے پھولوں کو کرسٹل کے گلدان میں سجا دیا پٹھانے خان اپنی منفرد آواز میں گا رہا تھا۔

میںڈا عشق وی توں
میںڈا یار وی توں

رات آدھی گزر چکی تھی امید شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے سفید لبادے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔

"اپنی نظر اتروا لینا شاید میری ہی لگ جائے۔" ارتل جیسے اس کے دل میں بولا۔ وہ کھلے دریچے پر کہنیاں ٹکا کر کھڑی ہو گئی بے بسی، جھنجھلاہٹ غصہ شدت اور حساسیت اس پر حملہ آور ہو رہی تھیں دل چاہ رہا تھا ابھی دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں پہنچ جائے اور اس کا گریبان پکڑ کر چیخ چیخ کر پوچھے۔

"کیا تم بھی میری طرح انوکھی سی آگ میں جل رہے ہو کیا تمہارا دل بھی آبلہ بنتا ہے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہتا ہے تم بھی بکھر کر سمٹنے جانے کی خواہش رکھتے ہو۔" اسے علم ہی نہیں ہوا کہ اس کا چہرا آنسوؤں سے بھیگتا جا رہا ہے۔

--*

بڑی پھوپھو کے بیٹے کا ولیمہ تھا ارتل بطور خاص وقت نکال کر آیا تھا دولہا دلہن دونوں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے ارتل امید راحت اور اقرا ایک ٹیبل پر تھے نوتن اور عاقب کو غور سے دیکھتے پا کر اقرا امید کو چھیڑ بیٹھی۔

"امید دلہن نہیں بنتا ہے کہو تو قاضی کو بلوا لاؤں ارتل بھائی بھی پاس ہیں۔" امید شرمندہ ہو کر جل گئی۔ ارتل غصے سے اسے دیکھنے لگا۔

"بچی ہے یہ فضول باتیں اس کے سامنے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بچی کہاں ہے کالج اسٹوڈنٹ ہے آپ نے غور سے شاید اسے دیکھا نہیں ہے تین چار سال بعد شادی کے قابل ہو جائے گی آپ کی برتھ ڈے پر اکثر مائیں اس کا بائیو ڈیٹا پوچھ رہی تھیں یہاں بھی تین چار بیگمات اسے غور سے دیکھ رہی ہیں۔" اقرا نے اچھی خاصی معلومات جھاڑیں۔

--*

کچن میں کوئی بھی ملازم نظر نہیں آ رہا تھا ارتل کو سر میں درد سا محسوس ہو رہا تھا اس نے امید سے چائے کی فرمائش کر دی وہ چائے لے کر اس کے کمرے میں آئی تو وہ بیڈ سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔

"یہ لیں چائے۔" اس نے پیالی ارتل کی طرف بڑھائی نہ جانے کیوں اس کا ہاتھ کانپا اور چائے ارتل پر گر گئی اسے تکلیف تو ہوئی پر وہ ضبط کر گیا۔

"آئی سوری میں نے جان کر نہیں گرائی ہے۔" وہ رو دینے کو ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے جاؤ اور لائیٹ آف کر جانا دھیان رکھنا کوئی میرے کمرے کی طرف نہ آئے میں رات کا کھانا نہیں کھاؤں گا کوئی مجھے بلائے نہیں۔" وہ وارڈروب میں جھانک رہا تھا۔

"اچھا قمیص مجھے اتار کر دیں جلدی جلدی واش کر دیتی ہوں ورنہ داغ پڑ جائے گا آپ کا نیا سوٹ خراب ہو جائے گا۔" اس نے آفر کی کچھ پس و پیش کے بعد وہ تیار ہو گیا اور قمیص اسے اتار کر دے دی وہ واش روم سے قمیص دھو کر نکلی تو تائی اماں کمرے میں باتیں کر رہی تھیں۔

"چائے گر گئی تھی میں نے دھو دی کہیں داغ نہیں پڑ جائے۔" اس نے وضاحت کی تو عظمی نے بیٹے کو گہری نگاہ سے دیکھا وہ قمیص اتارے بیٹھا ہوا تھا اور امید کے واش روم سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ نکلے تو وہ نہا کر کپڑے تبدیل کرے۔

خاصی دیر بعد وہ اس کے کمرے سے اٹھیں تو امید باہر ٹہل رہی تھی گلابی کپڑوں میں وہ نوشگفتہ سی کلی لگ رہی تھی انہوں نے نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری وہ ماں تھیں امید ان کے ہاتھوں میں پلی تھی وہ اس کا ایک ایک رنگ پہچانتی تھیں اس کی پاگل محبت والا رنگ انہیں خوفزدہ کر گیا تھا ارتل کے دل میں کوئی اور تھا ورنہ وہ بخوشی اسے مانگ لیتیں۔

--*

"پتہ ہے تمہارے ارتل صاحب نے لڑکی پسند کر لی ہے۔" راحت نے دھماکا کیا وہ پوری جان سے لرز گئی۔

"کوئی نہیں۔" وہ خالی خالی لہجے میں بولی۔

"جی ہاں جب وہ شیخوپورہ میں تھے تو تب ہی یہ چکر چلا تھا تائی اماں بہت جلد پرپوزل لے کر جانے والی ہیں۔" انکشاف در انکشاف ہو رہے تھے اسے ساری مسکراہٹوں کا خراج آنسوؤں کی صورت میں ادا کرنا پڑ رہا تھا کتاب کھول کر بیٹھتی تو ذہن خالی ہو جاتا کتر کتر زبان خاموش تھی۔

کہا بھی تھا
میری انجان آنکھو

کہا بھی تھا کہ
خواب نہ دیکھو
اس راہ پہ نہ چلو
جہاں پاؤں فگار ہو جائیں
اور دل بھی خار ہو جائیں
اتنے خواب نہ دیکھو
کہ انہیں آنکھوں میں رہنے کے لیے جگہ ہی نہ ملے
مگر
خواب دیکھ دیکھ کے
میری آگہی سے انجان آنکھوں نے
دریا ہونا سیکھ لیا ہے
دل نے درد بننا سیکھ لیا ہے
اور جذبوں نے
سرد ہونا سیکھ لیا ہے

--*

پہلے روشان کے ماں باپ نے ازل کو انگوٹھی پہنائی اور پھر سب ادھر سے شیخوپورہ گئے تھے۔ بجی سنوری حسین سی روشان فاتح ملکہ لگ رہی تھی ایک بات سب نے نوٹ کی کہ وہ اپنے حسن پہ نازاں ہے امید سے تعارف ہونے پر وہ عجیب سے لہجے میں بولی تھی۔

''اوہ تو آپ ہیں امید۔''

مجموعی طور پر وہ کسی کو بھی پسند نہیں آئی تھی صباحت تو برملا کہہ رہی تھی۔

''میرا بھائی اتنا زبردست ہے روشان بھائی کے مقابلے میں کچھ خاص نہیں ہے۔''

اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا ازل خوش تھا ہاں امید کی ہستی زیر و زبر ہو گئی تھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ
وہ ہوا ہے
میرے ہاتھ نہ آئے گا
وہ بادل ہے
جسے میں چھو نہ پاؤں گی
پھر بھی میں نے
ہوا کو پکڑنا چاہا
بادل کو چھونا چاہا

--*

منگنی کے بعد روشان نے کمہ سن کرانی ہوسٹل ادھر ہی کروالی تھی اب روز وہ ازل سے مل سکتی تھی جب اس کی آف ہوتی وہ گھر پر چلی آتی رات ادھر رکتی اور دوسرے روز چلی جاتی اس کا پہلا امپریشن مغرور لڑکی کا تھا گھل مل جانے اور اس کی خوش مزاجی کے باعث ختم ہو گیا تھا وہ جب آتی تو کھانے کا خصوصی اہتمام ہوتا رت جگا منایا جاتا اچھی اچھی موویز دیکھی جاتیں کارڈز کھیلے جاتے کیرم کی بازیاں جمتیں پنجہ آزمائی کی جاتی۔

امید نے غیر محسوس انداز میں ان کی محفلوں سے غیر حاضر رہنا شروع کر دیا تھا وہ اپنا بھرم بھی نہیں کھونا چاہتی تھی اس روز عدی اسے لے ہی آیا خوب ہنسی مذاق ہو رہا تھا روشان ان کے پرانے البمز دیکھ رہی تھی وہیں اس کی اور ازل کی تصویر تھی روشان نے ازل کو تو پہچان لیا تھا ہاں اس بچی کے بارے میں لاعلم تھی اقرا اور راحت نے ہنس ہنس کر اس کے بچپن کا قصہ دہرانا شروع کر دیا امید نے جھپٹ کر البم سے تصویر نکالی اور ٹکڑے ٹکڑے کر دی وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔

''مت آپ ہر کسی کو میری حماقتوں کی داستان سنایا کریں بچی نہیں ہوں اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔''

وہ روتی ہوئی کمرے سے بھاگ گئی کمرے میں سناٹا سا چھا گیا۔ سب خاموش ہو گئے تھے ازل کے چہرے پر پریشانی کی تحریر با آسانی پڑھی جا سکتی تھی۔

''اتنی اچھی تصویر تھی خواہ مخواہ ہی پھاڑ دی۔'' روشان نے پھٹے ٹکڑے اٹھا کر جوڑنا شروع کیے۔

ازل اسے منانے کے لیے اس کے کمرے کی طرف آیا تو دروازہ لاک تھا ہاں اندر سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔

دنیا میں سب نا ممکن ممکن ہوا
اک تیرے میرے ملن کے سوا

چاہا ہوں واپس یہ سوچ کر
کہ تیرے دل میں ہے کوئی دوسرا
سب لوگوں نے کہا نہیں ملتے کبھی خوابوں کے لوگ
دل میرا مگر یہ کیوں نہیں مانتا کہ تیرے سوا
کبھی کچھ سوچا نہ تھا
جو راستہ تیرے گھر کا تھا
پر فاصلہ تیری نظر کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جو میری چاہت سے کم نہ ہوا
دنیا میں سب نا ممکن ممکن ہوا

امید تکیے منہ پر رکھے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا اداس گانا آتا اور رونے کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا۔

ازل نے تین چار بار دروازہ دھڑ دھڑایا پر اس نے نہیں کھولا۔

--*

امید نے ازل کے ساتھ کالج جانے سے انکار کر دیا وہ لوکل گاڑی پہ آنے جانے لگی دو تین دن تو وہ دیکھتا رہا پھر اس سے رہا نہیں گیا صبح وہ بیگ اٹھا کر نکلنے لگی تو ازل نے اسے جا لیا۔

''گھر میں چار چار گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں اس کے باوجود تم دوسری گاڑیوں میں دھکے کھاتی پھرتی ہو۔''

''میں نے عدیم بھائی سے کہہ کر وین لگوالی ہے کل سے وہی مجھے پک اینڈ ڈراپ کرے گی۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

''میں کس لیے ہوں پھر تم کیوں ایسے کر رہی ہو تمہاری اس حرکت سے مجھے کتنا دکھ پہنچا ہے تم اس کا اندازہ تک نہیں کر سکتیں۔''

''آپ میرے لیے دکھی نہ ہوا کریں۔'' سرد لہجے میں بول کر وہ نکل گئی۔

اس روز پھر روشان کی آف تھی وہ چلی آئی سٹنگ روم میں محفل جمی ہوئی تھی ڈرائی فروٹس کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا اچھی خاصی سردی تھی دسمبر کی لڑکڑاتی ہوا لہو تک برف کر رہی تھی۔ گرم گرم کمرے کی فضا بڑی حرارت بخش تھی امید غائب تھی حالانکہ باقی سب یہیں جمع تھے ازل ہی کو اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے گرم گرم کمرا چھوڑ کر نکلا تو وہ اسے لان کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھی ملی یوں اکیلی وہ ڈار سے بچھڑی کونج لگ رہی تھی کاٹن کے ہلکے سے کپڑوں میں ملبوس وہ کسی بھی سوئیٹر اور گرم شال سے بے نیاز تھی ازل کے دل کو کچھ ہوا اس کے قریب پہنچتے پہنچتے وہ اپنی لیدر جیکٹ اتار چکا تھا ازل نے اس کے کندھوں پر جیکٹ پھیلائی تو وہ چونکی اسے دیکھتے ہی اس نے بجلی کی تیزی سے جیکٹ نیچے پھینک دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''امید جانو اتنی سخت سردی میں کیوں بیٹھی ہو بیمار پڑ کر میری جان کو عذاب میں لے آؤ گی اندر آؤ۔''

ازل نے رسان سے کہتے ہوئے جیکٹ دوبارہ اس کے شانوں پر ڈال دی۔

''کیوں میں کیوں آپ کی جان کو عذاب میں ڈالوں گی آپ کی جان کوئی مجھ میں ہے۔'' اس کی آواز بھیگی بھیگی تھی۔

''ہاں تم میری جان ہی تو ہو کیا نہیں ہو۔'' وہ اس کے بے حد قریب کھڑا پوچھ رہا تھا۔

خالد جو بات بات پہ کہتا تھا مجھ کو جان
وہی شخص آخر میں مجھے بے جان کر گیا

''آپ میری پروا مت کیا کریں مت میرے پیچھے پیچھے گھوما کریں نفرت ہے مجھے آپ کی اس بناوٹی محبت سے آخر آپ کا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے بتائیں مجھے۔''

امید کا یہ لہجہ یہ انداز اسے حیرتوں کے سمندر میں ڈبو گیا ازل کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا امید نے جیکٹ اس کے سینے پر دے ماری اور اپنے کمرے کی طرف بھاگی سامنے روشان کھڑی تھی ایک سیکنڈ کے لیے وہ رکی اور نکلتی چلی گئی یہ دیکھے بغیر کہ وہ کیا قیامت ڈھا گئی ہے۔ ازل ٹوٹے قدموں سے وہیں ڈھے گیا۔

ادھر وہ دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر رو رہی تھی دل دہائیاں دے رہا تھا امید تو نے کیا کر دیا ہے وہ کیا سوچ رہا ہو گا اسے تمہارے خیالات کی بھلا کیا خبر ہے کیوں

اپنے ساتھ اسے بھی سزا دے رہی ہو۔

اس کا دھواں دھواں چہرا امید کا دل مسل گیا تھا جیسے۔

صبح جب وہ آفس کے لیے نکلا تو وہ امید کے رات کے رویے کے بارے میں سوچ رہا تھا رات وہ سوچ سوچ کر سو ہی نہیں سکا تھا آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اس کے تھکے تھکے نڈھال انداز کو سب نے محسوس کیا تھا وہ ایکسر سائز کے بعد فریش ہو کر ڈائننگ ٹیبل پہ یوں آتا تھا کہ دیکھنے والی آنکھ میں بھی تازگی اتر آتی تھی آج اتنے سالوں میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ جمنازیم نہیں گیا تائی اماں کہتی تھیں کہ موت کا فرشتہ بھی اگر آجائے تو اترل اس سے کہے گا پہلے مجھے ایکسر سائز کرنے دو پھر میری روح نکالنا ویسے بھی وہ اپنی فٹ نس کے بارے میں بڑا محتاط رہتا تھا۔ ناشتے پر بھی آج اس نے صرف ایک پیالی چائے پی تھی۔

اس کا ذہن امید میں یوں بری طرح پھنسا ہوا تھا کہ اسے سر پر آئی سفید ایف ایکس کی خبر ہی نہیں ہوئی گاڑی پوری قوت سے اترل کی گاڑی سے ٹکرائی شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ہوا اس کے بازو اسٹرنگ پر بے جان ہو گئے وہ اعلیٰ افسر تھا کئی گاڑیاں بیک وقت اسے ہاسپٹل پہنچانے کے لیے رک گئیں شاہ ولا کے مکینوں کو فوراً" اس سانحے کی خبر ہو گئی۔ اترل کو کافی شدید چوٹیں آئی تھیں سینے میں شیشے کے ٹکڑے اتر گئے تھے ایک بازو کی ہڈی کریک تھی فی الحال اس کی حالت نازک ہی تھی جس ہاسپٹل میں اسے لایا گیا تھا روشان بھی یہیں کام کرتی تھی اس وقت وہ آن ڈیوٹی نہیں تھی شام میں اسے آنا تھا۔

سب ہاسپٹل پہنچ گئے تھے عظمیٰ اپنے کڑیل وجوان بیٹے کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر حواس چھوڑ بیٹھی تھیں۔ امید کالج سے گھر لوٹی تو صرف بوا تھا اس نے ہی اسے وہ روح فرسا اطلاع دی اسے یقین تھا کہ یہ صرف اس کی وجہ سے ہوا ہے وہ بھی اس کے ساتھ ہاسپٹل چلی آئی۔

تیسرے دن اسے دیکھنے کی اجازت ملی وہ اپنے ہوش میں ہی نہیں تھا روشان کے گھر والے بھی آئے ہوئے تھے۔ اترل کا کمرا گیٹ ویل سون کے کارڈز اور پھولوں سے بھر گیا تھا۔ جب تک وہ ہوش میں نہیں آیا امید اسے دیکھنے جاتی رہی بعد میں وہ ایک بار بھی نہ گئی یہاں تک کہ وہ ڈسچارج ہو کر گھر آگیا تھا ابھی پوری طرح صحتیاب نہیں ہوا تھا اس لیے اپنے کمرے میں ہی پڑا رہتا تھا امید حتی الامکان اس کے سامنے جانے سے گریز کرتی کسی اور نے محسوس کیا یا نہیں مگر اقرا اور عدی کی نگاہیں بہت تیز تھیں اترل کی دیوانی ایک بار بھی گھر آنے کے بعد اس کے کمرے میں نہیں گئی یہاں تک کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اترل نے اس کا پوچھ ہی لیا زندگی میں پہلی بار اس کا رویہ بدلا تھا اگر اسے معمولی سا بخار بھی ہو جاتا تو امید پریشان ہو جاتی اپنے ننھے منے ہاتھوں سے دعا مانگتی کہ وہ جلدی ٹھیک ہو جائے اسے دوا ہاتھوں سے پلانے کی ضد کرتی اس کا سر دباتی بالوں میں انگلیاں پھیرتی اور جب وہ ٹھیک ہو جاتا تو کتنی خوش ہوتی پھر بھی اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چیک کرتی کہ اب اس کی پیشانی گرم تو نہیں ہے پورا ایک ماہ ہو گیا تھا اسے بیڈ پر پڑے ہوئے وہ ایک بار بھی اس کا حال پوچھنے نہیں آئی کیا واقعی وہ اب بڑی ہو گئی تھی فیصلہ کرنے والی۔

"امید تم اترل بھائی کو دیکھنے کیوں نہیں جا رہی ہو۔" اقرا نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔

"جاتی تو ہوں۔" اس نے جھوٹ گھڑا۔

"ادھر دیکھو میری طرف تم اب جھوٹ بھی بولنے لگی ہو کتنی بار وہ تمہارا پوچھ چکے ہیں کیا آپس میں کوئی ناراضگی چل رہی ہے۔" اس نے امید کا چہرا جانچا۔

"نن نہیں۔" پکڑے جانے پر وہ گھبرا گئی۔

"تو اٹھو جاؤ ان کا حال احوال پوچھ لو یوں خود کو ارزاں مت کرو اس کا اب فائدہ بھی نہیں ہے۔" اقرا نے اس سے نظر نہیں ملائی تو وہ چونک گئی۔ اس کا آخر کیا مطلب ہے یہی ناں کہ وہ سب جانتی ہے۔ جو جذبے اس نے دل کی گہرائیوں میں سینت سینت کے رکھے تھے وہ سر عام عیاں ہو رہے تھے تبھی تو وہ اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں سمجھا گئی تھی۔

اترل کے کمرے تک کا سفر اس نے بہادری سے

طے کیا وہ لیٹا ہوا تھا اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا نہ جانے یہ امید کی نگاہوں کا دھوکا تھا کہ کچھ اور اسے دیکھتے ہی اترل کی آنکھیں چمک اٹھیں امید نے کرسی اٹھا کر اس کے بیڈ سے قدرے فاصلے پر رکھی وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی بڑے عام سے الفاظ میں اس کا حال پوچھا دس پندرہ منٹ بعد رسمی سا اظہار افسوس کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ اترل کو بھولنے کی کوششیں کر رہی تھی اس لیے خود کو مکمل طور پر کالج اور کتابوں میں غرق کر لیا تھا جب بھی دیکھو وہ کتابوں میں سر دیئے ملتی اترل سے اس کی بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی وہ اسے مخاطب کرنا بھی چاہتا تو اس کے سرد سے تاثرات دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیتا وہ چاہتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح اس سے ہنسے بولے ضد کرے فرمائش کرے اس کا یہ رویہ وہ جس دکھ سے برداشت کر رہا تھا وہی جانتا تھا۔

وہ دو ڈھائی سال کی تھی جب اترل نے اس کے معاملے میں خود کو با اختیار سمجھنا شروع کیا تھا اور امید کی صبح ہی اس کے نام کی مالا جپنے سے ہوتی تھی وہ جیسے اس کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا اس کی مرضی کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرتی تھی جو بات اترل کہتا وہ اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی پھر اب وہ کیوں ایسی ہو گئی تھی سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں چٹخنے لگتیں۔

"عظمیٰ جلد از جلد اترل کی شادی کے معاملے سے نمٹنا چاہتی تھیں زیادہ دیر وہ امید کے اعصاب کو جنگ کرتا نہیں دیکھ سکتی تھیں اترل کے ساتھ اس کی بے رخی کا سبب انہیں معلوم ہو گیا تھا ادھر عدی کے ہونے والے سسر بھی اپنی بیٹی کی فوراً" شادی کرنا چاہتے تھے چچی نے تو تیاریاں شروع کر دی تھیں عظمیٰ نے بھی روشان کے گھر والوں سے بات کی تھی انہوں نے تین ماہ کا ٹائم مانگا تھا یوں عدی کی باری پہلے آگئی تھی۔

عظمیٰ نے زیورات اور کپڑے پسند کرنے کے لیے روشان کو بلایا تھا اسے علم نہیں تھا کہ وہ اس کے گھر بات کر چکی ہیں ایک براڈ مائنڈڈ ساس کی طرح وہ ہر چیز اس کی پسند سے خریدنا چاہتی تھیں۔ وہ آگئی تھی اور اترل کے کمرے میں تھی تھوڑی دیر بعد ہی اس کے کمرے سے تیز تیز باتوں کی آوازیں آنے لگیں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا روشان تو بہت دھیمے لہجے میں بات کرتی تھی اب اس کی چیختی آواز نے سب کو کمرے کے دروازے پر لا کھڑا کیا تھا امید بھی دہل کر چلی آئی تھی۔

"میں پہلے بھی کہتی تھی کہ تمہاری آنکھوں میں کسی اور کا عکس ڈولتا ہے پر تم نہیں مانتے تم نے شیخوپورہ میں بھی اس کا ذکر کر کر کے میرے کان کھا لیے تھے اسے یہ پسند ہے اسے وہ پسند ہے وہ یوں ہنستی ہے یوں بولتی ہے یوں چلتی ہے یوں بولتی ہے میں جان گئی تھی تم کسی اور کے قبضے میں ہو۔" روشان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس نے انگلی سے منگنی کی انگوٹھی اتاری کمرے کے باہر کھڑے افراد کا اسے ذرہ بھر خیال نہیں تھا۔

"یہ لو یہ اسے پہنانا اگر کوئی غلط فہمی ہے تو یہ ڈائریاں پڑھ کر دور کر لو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی چار پانچ ڈائریاں زبردستی اترل کے ہاتھ میں تھمائیں اور باہر نکل گئی۔

"کیا ہوا ہے کیا ہوا ہے۔" سب نے اسے روکنا چاہا۔

"میں غاصب نہیں ہوں۔" روشان نے امید کے پاس رک کر فقط ایک جملہ بولا اور پورچ میں کھڑی گاڑی اسٹارٹ کر کے یہ جا وہ جا۔ ستون کے ساتھ کھڑی امید کا چہرا سفید پڑ گیا تھا اپنے ہاتھ سے لکھی ان ڈائریوں کو وہ با آسانی پہچان سکتی تھی جانے یہ روشان کے ہاتھ کیسے لگی تھیں ان ڈائریوں میں کیا کچھ نہیں تھا اترل کے لمحے لمحے کا حساب ان میں درج تھا آج اس نے کیا پہنا ہے کیا کھایا ہے کہاں گیا ہے کس سے ملا ہے کیا کیا باتیں کی ہیں کیسا لگ رہا ہے باہر سے کتنے بجے آیا ہے۔ صبح کب بیدار ہوا ہے بالوں کا اسٹائل کب تبدیل کیا ہے سب کچھ لکھا ہوا تھا ہوسٹل جانے کے بعد اس کے خیالات میں جو تبدیلی آئی تھی اس نے معصومیت سے اسے بھی درج کر دیا

تھا پھر اس کے قطرہ قطرہ لہو ہوتے دل کا حساب بھی انہی کاغذوں میں بند تھا ابھی سب اس کے راز سے آگاہ ہو جائیں گے اور اور۔۔۔ اس کے آگے اس سے کچھ سوچا ہی نہیں گیا وہ پورے قد سے کھڑے کھڑے ماربل کے فرش پر گری تھی۔

"تایا جان امید کو دیکھیں کیا ہوا ہے۔" راحت چیخی سب کو اس کی پڑ گئی اتزل نے تمام ڈائریاں سمیٹ کر دراز میں رکھ دیں اور گاڑی کی چابی اٹھا کر اس کے وجود کو نظر انداز کرتا لمبی لمبی سڑکیں ناپنے لگا۔

"روشان نے تمہارے نام کے ساتھ اس کا نام اچھالا ہے اب کوئی بھی سب کچھ جانتے بوجھتے اس کا رشتہ لینے نہیں آئے گا فرض کیا اگر اس کی شادی ہو بھی گئی تو اس کی سسرال والے اور شوہر تمہارے نام کے طعنے دے دے کر اسے بے مول کر دیں گے اگر تم روشان کا نام نہ لیتے تو تمہاری ماں کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی یتیم بچی ہے ہمارے سامنے پلی بڑھی ہے پھر تمہیں چاہتی بھی ہے اس کی محبت کی قدر کرو اور اسے نئے روپ میں قبول کر لو۔"

بند کمرے میں لقمان، فواد، شاہ زیب جہانزیب ان کی بیویاں اور عظمٰی سب اتزل کو قائل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

"کیا یہ اتنا ہی آسان ہے وہ مجھ سے تقریباً پندرہ سولہ سال چھوٹی ہے اس کے احساسات کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔" اتزل تپ گیا تو فواد کو بھی غصہ آ گیا۔

"تو کیوں اس کی کمزوری بن گئے تھے کیوں اسے اتنی چاہت دی کہ وہ تمہیں اول و آخر اپنا سمجھنے لگی۔"

"میرا کوئی قصور نہیں ہے وہ خود اس طرح سوچ رہی ہے میں نے اشارتاً بھی کبھی اس سے ایسی بات نہیں کی خود اس کے دل میں بے ایمانی تھی۔" اتزل نے اپنا دامن بچایا تو فواد مارے غصب کے کانپنے لگے۔

"تم خود بے ایمان منافق اور بددیانت ہو اس کا نکاح تمہارے ساتھ ہی ہو گا میں نے اس کی ڈائری پڑھی ہے اس نے واضح الفاظ میں خودکشی کی طرف اشارہ کیا ہے اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں شوٹ کر کے بھی پھانسی چڑھ جاؤں گا اگر میری بات منظور ہے تو رات کو میرے کمرے میں آ جانا۔" فواد کا انداز قطعی بے لچک تھا۔

وہ رات کو ان کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ لڑکیوں کو اس کی رضامندی کی خبر ہو گئی تھی وہ بے پناہ خوش تھے خاص طور پر اقرا اور عدی وہ امید کی آنکھوں کی جوت سلامت دیکھنا چاہتے تھے وہ اندر کے لیٹی ہوئی تھی سب کزنز نے یکے بعد دیگرے اسے مبارکباد دی تھی اتزل کے تاثرات دیکھ کر کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اسے کچھ کہتا۔

"تم جیت گئی ہو کتنی گھنی ہو بچپن ہی سے اپنا جوڑ منتخب کر لیا تبھی تو اسے بھائی نہیں کہتی تھیں۔" اقرا کے ذہن پر ماضی کی خوب صورت یاد نے دستک دی سب امید کو چھیڑنے لگے۔ مغرب کے بعد اتزل کے ساتھ اس کا نکاح تھا رخصتی ڈیڑھ ماہ بعد عدی کی شادی کے ساتھ ہی عمل میں آنی تھی تیمور لقمان اور فواد مولوی صاحب کے ساتھ اس کی رضامندی لینے آئے تو اس نے لرزتے ہاتھوں سے سائن کر دیے۔ بعد میں مٹھائی کھائی گئی اتزل فوراً "غائب ہو گیا تھا اب سب کے شوخ فقروں کا نشانہ امید تھی۔

"کتنی لکی ہو تم جو چاہا پا لیا یہاں تک کہ اتزل کو بھی۔" راحت نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ مسکرا دی ایسی مسکراہٹ جس میں فتح کی آمیزش تھی۔

فواد امید کی شادی کی تیاری کسی سگی بیٹی کی طرح کر رہے تھے اتزل کے منع کرنے کے باوجود وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی خرید رہے تھے اتزل اس شرط پر نکاح کے لیے تیار ہوا تھا کہ شادی کے بعد وہ امید کو الگ گھر میں رکھے گا کسی کو بھی اعتراض نہیں تھا اتزل نے خود ایک پوش پرسکون علاقے میں سپر لگژری بنا بنایا گھر خرید لیا تھا جس کو آج کل فرنشڈ کروا رہا تھا سب لڑکیاں امید کو چھیڑتیں کہ اتزل کو کسی تیسرے کی مداخلت گوارا نہیں ہے تبھی الگ گھر خریدا ہے۔ عظمٰی نے

اعتراض کیا تھا کہ رخصتی ڈیڑھ دو سال بعد کرتے ہیں تب تک امید مزید سمجھدار ہو جائے گی پر فواد نہیں مانے تھے ان کا کہنا تھا کہ شادی کے بعد لڑکیاں بہت جلد میچور ہو جاتی ہیں وہ بھی ہو جائے گی خوامخواہ کی دیر مناسب نہیں ہے بنا بنایا کام بگڑ جائے گا شاید اتزل ہی رہی تڑوا لے ان کی دلیل وزن دار تھی سو وہ اپنے موقف سے ہٹ گئی تھیں۔

عدی کے ولیمے کے تیسرے روز امید کی رخصتی تھی اس نے عدی کی شادی کی تمام رسموں کو بھرپور انجوائے کیا تھا ضد کر کے مایوں میں بیٹھنے کے باوجود اس کی مہندی پر گئی تھی بارات و ولیمہ اٹینڈ کیا بارہا اتزل سے سامنا ہوا مگر اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تیمور نے اتزل کے افسران کولیگ، ماتحت اور ان کی بیگمات سے امید کا تعارف کروایا۔

"بہت امیچور اور انوسینٹ ہے۔" مسز شیراز نے تبصرہ کیا تو ولی نے لقمہ دیا۔

"اتزل بھائی نے ہی اسے اتنا بڑا کیا ہے۔" پیچھے کھڑے اتزل کے سینے میں جیسے کسی نے نوکیلا خنجر اتار دیا تھا۔

"لڑکی کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو ایک دو بچوں کے بعد برابر کی لگنے لگتی ہے۔" مسز شاہد بولیں تو امید بے طرح جھینپ گئی قریب کھڑے اتزل کو وہ بھی دیکھ چکی تھی وہ خواتین کی پر اشتیاق نگاہوں سے بچتی بچاتی نکل آئی۔

عدی کی دولہن آ چکی تھی لڑکیوں کے کھلے کھلے بھرے امید بھی سن رہی تھی بلکہ راحت نے تو مشورہ دیا کہ تم بھی کچھ گر سیکھ لو۔

--*

عدی کی دلہن دلہناپے کی شرم و حیا یکسر فراموش کیے امید کے مومی گداز ہاتھوں پر مہندی کی کون پکڑے بڑی مہارت سے گل بوٹے بنا رہی تھی ساتھ بڑے فراٹے سے اسے کام کی باتیں بتاتی جا رہی تھی قریشہ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ دو دن پہلے اس گھر میں آئی ہے بس کھلی طبیعت کی وجہ سے سب سے فری ہو گئی تھی عدی بھی خوش تھا اتنی اچھی اور سمجھدار لڑکی پا کر۔

اقرا، لیزا، رومیزہ، راحت اور صباحت اپنے اپنے بچوں کو شوہروں کے سپرد کر کے امید کے کمرے میں دھرنا دیے بیٹھی تھیں صباحت اس کا برائیڈل ڈریس پریس کر کے بیڈ پر رکھ گئی تھی امید کی مہندی سوکھ چکی تھی اقرا اس کے لمبے گھنے بال سلجھا رہی تھی۔ اس نے سب کو امید کا ضروری سامان لانے دوڑا دیا۔

"امید تم اتنی چھوٹی سی ہو کہ میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے کہ تمہیں کیا کیا سمجھاؤں۔" اس نے برش روک کر امید کا معصوم و انجان چہرہ دیکھا قریشہ جو چوڑیاں میچ کر رہی تھی اس کی بات سن کر قریب آ گئی۔

"ہم سمجھا دیتے ہیں۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

جیسے ہی امید کپڑے تبدیل کر کے آئی بیوٹیشن آ کے بیٹھی ہوئی تھی اس نے ساری مہارت امید کو سجانے بنانے میں صرف کر دی آف وائیٹ لانگ شرٹ اور شرارے میں ڈھیروں زیورات پہنے بالوں میں پھول سجائے وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی بولی نے سامنا ہوتے ہی امیزنگ کہا کوئی سلیپنگ بیوٹی کا خطاب دے رہا تھا کوئی کم عمر شہزادی کا۔ پلکیں اٹھاتے گراتے دھیرے سے مسکراتے دیکھ کر اس پر کانچ کی مورت کا گمان ہو رہا تھا سب سراہ رہے تھے فواد اور عظمٰی بہت خوش تھے انہوں نے مبشر اور طیبہ کی امانت آج حقدار کے سپرد کر دی تھی۔

رخصتی رات گئے عمل میں آئی وہ سب اسے اتزل کے نئے گھر کے بیڈ روم میں چھوڑ کر جا چکے تھے پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی تھی اس لیے عظمٰی نے لڑکیوں کو زیادہ دیر بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ امید نے ایزی ہوتے ہی خوب صورتی سے سجے بیڈ روم کا جائزہ لیا اسے فلموں ڈراموں میں سجے ہوئے بیڈ روم زہر لگتے تھے مگر یہاں نفاست و نزاکت کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا کہیں سے بھی سطحی رنگ نہیں جھانک رہا تھا۔

قدموں کی آہٹ ابھرتے ہی وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گئی، وہ ہزار بار اتزل کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں بیٹھی تھی اس سے باتیں کی تھیں اس کے سینے پر سر رکھ کر کہانیاں سنی تھیں پر آج اس کے تصور کے ساتھ ہی

اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا تھا دل دھک دھک کرنے لگا تھا وہ نئی حیثیت سے تو پہلی بار اس کے کمرے میں آئی تھی نیا رشتہ' نیا تعلق نئے نئے احساسات اس کے اندر میٹھا میٹھا سا درد جگانے لگے۔

دھیرے سے دروازہ کھلا ازل کے پسندیدہ پرفیوم کی خوشبو پہلے اندر آئی وہ بعد میں اندر آیا۔ امید کی نگاہیں اپنے پاؤں کے ناخنوں پر مرکوز ہو گئیں وہ صوفے پر بیٹھ گیا پاؤں کو جوتے سے آزاد کیا گریبان کے اوپری دو بٹن کھولے آستینوں کے کف' کہنیوں تک چڑھا لیے پاکٹ سے تمام چیزیں نکال کر صوفے پر اچھال دیں خاصی دیر وہ یونہی بیٹھا رہا امید کو گھبراہٹ ہونے لگی پھر وہ بیڈ پر اس کے چہرے کو نگاہوں کی گرفت میں لیتے اس کے سامنے بیٹھ گیا اس کا چہرہ گھونگھٹ کی قید سے آزاد تھا دوپٹہ پیشانی سے خاصا اوپر پنوں سے لگا کر سیٹ کیا گیا تھا وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا امید کی گھنی پلکیں بار بار رخساروں پر لرز رہی تھیں۔

"ہوں۔" کتنی دیر بعد اس کے لبوں سے یہ مبہم سا لفظ نکلا۔

"نکاح سے پہلے میں تمہیں ذہنی جسمانی اور جذباتی طور پر بچی ہی سمجھ رہا تھا سولہ ساڑھے سولہ سال کی لڑکی بچی ہی ہوتی ہے بشرطیکہ اسے زمانے کی آلودگیوں نے نہ چھوا ہو تمہارے بارے میں میرا پہلے یہی خیال تھا کہ تمہیں نئی دنیا کی ہوا نہیں لگی ہے مگر تم نے اپنی حرکتوں سے میرے خیال کو غلط ثابت کر دیا ہے اس عروسی سوٹ میں تم بچی نہیں زمانہ ساز عورت لگ رہی ہو ابھی تمہاری عمر یہ سوٹ پہننے کے قابل نہیں تھی جذباتی طور پر تم شاید خود کو میرے برابر سمجھ رہی ہو تمہاری ڈائری میں یہی لکھا ہے ناں کہ محبت کے عمل کے دوران محبوب اور محب ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں' عمر کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا تمہارے اس نظریے کے مطابق میں تمہارے برابر ہوں مگر میرے نظریے کے مطابق تم تمام عمر بھی میری سطح کے برابر نہیں آسکتیں چاہے سات جنم بھی لے لو۔

واقعی تم بہت بڑی ہو گئی ہو بچی نہیں زہریلی ناگن ہو جس نے میرے خوابوں کو ڈس لیا ہے تم ایک حسینہ اور جلاپے کی آگ میں ماری عورت ہو تمہاری اس صورت تمہارے اس روپ سے جو تم نے مجھے ... کرنے کے لیے اپنایا ہے اس سے مجھے گھن آرہی ہے۔"

وہ قہر و غضب میں بھرا زخمی درندہ لگ رہا تھا جو کسی بھی لمحے اسے چیر پھاڑ سکتا تھا وہ فق ہوتے چہرے کے ساتھ اس کے تذلیل بھرے فقرے سن رہی تھی۔

"میرا دل چاہ رہا ہے تمہاری گردن دبا دوں تمہارا خون پی جاؤں تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلاؤں۔" وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ ... اس کے قریب ہوا اور اس کی صراحی دار زیورات سے بوجھل گردن دونوں ہاتھ سے دبوچ لی امید کی آنکھیں ابل آئیں اور سانس سینے میں گھٹ کر رہ گیا وہ کسمسائی گردن کا گلوبند جیسے اس کے حلق میں پیوست ہوا جا رہا تھا۔

"آئی ول کل یو۔" ازل نے ہاتھوں کا دباؤ بڑھایا وہ ایک دم بے جان سے ہو گئی ازل نے بجلی کی تیزی سے اسے چھوڑ دیا وہ بالکل بے حس و حرکت تھی اس نے اس کے بالوں سے موتیے کے گجرے نوچ کر نکالے دوپٹہ اتار کر مسہری سے دور اچھال دیا گردن سے گلوبند نکالا تو سرخ سرخ سے نشان واضح ہو گئے اس نے بڑی بے رحمی سے اسے زیورات کی قید سے آزاد کیا اور بیڈ شیٹ الٹ پلٹ دی کمرا صبح تک کے مطلوبہ اسٹیج کے لیے تیار ہو چکا تھا وہ اپنا من پسند ایکٹ بھی سوچ چکا تھا بکھری بکھری بے ترتیب مسہری دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی اور باہر آکر دوسرے بیڈ روم میں گھس گیا۔

*_*_*

"تھوہری اپ شاور لے کر فریش ہو جاؤ تمہارے کپڑے ڈریسنگ روم میں ہیں۔" امید کو ازل کی آواز برزخ سے آتی محسوس ہوئی اس نے دوسری بار اسے سختی سے باقاعدہ اٹھا کر بٹھایا تو وہ عالم ہوش میں آئی مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا گلے میں درد کا احساس ہو رہا تھا۔

"میری بات غور سے سنو شاور لے کر تیار ہو جاؤ گھر والے تھوڑی دیر میں پہنچ رہے ہیں۔" وہ سختی سے بولا تو امید میکانکی انداز میں اٹھی۔ فرحت بخش پانی کی پھوار گردن پر پڑی تو اسے مرچیں سی لگتی محسوس ہوئیں اسے اپنا حلق سوجا سوجا لگ رہا تھا۔

"یہ شخص تو میری ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا تھا کجا کہ خود یوں کرے۔"

"پھر اس کی رات والی حرکت کیا معنی رکھتی ہے۔" کوئی دل سے بولا اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں اسے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا اس نے پھل کاٹنے والی چھری سے بے دھیانی میں خود کو کٹ لگا لیا تھا اور خون نکلتے دیکھ کر زور زور سے رو رہی تھی ازل نے اس کے ہاتھ کی بینڈیج کی تھی اسے روتے دیکھ کر وہ بار بار اسے چپ کراتا بینڈیج والا ہاتھ چومتا اس کا ذہن زخم سے ہٹانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرتا۔ اس کا ہتھیلی پہ بچپن کے زخم کا نشان ابھی تک موجود تھا وہ جب بھی اپنی ہتھیلی کھولتی تو اس نشان پہ اسے دو مسیحا صفت ہونٹوں کا لمس محسوس ہوتا کتنی بار وہ اس نشان کو اپنے ہونٹوں سے چھو کر شرمائی تھی۔

"رات کو اسے کیا ہو گیا تھا اس نے کیوں سنگدلوں والا برتاؤ کیا تھا۔"

وہ کپڑے بدل کر باہر آئی تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی گردن کو غور سے دیکھا گلوبند چبھنے سے جا بجا جیسے کانٹے کے نشان بن گئے تھے اسے واقعی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ازل نکھرا نکھرا سا اخبار میں سر دیئے بیٹھا تھا وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی "اس نے امید کو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی۔

"رات کو جو کچھ ہوا کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کل تو میں نے چھوڑ دیا تھا آئندہ۔" اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو وہ سہم گئی یہ وہی ازل تھا جو اس کے ساتھ ہمیشہ نرمی سے بات کرتا تھا۔ ابھی وہ اسے ہدایات دے ہی رہا تھا کہ وہ سب چلی آئیں بزرگ خواتین گھر پر ہی تھیں وہ دونوں کے لیے ناشتا لے کر آئی تھیں۔

"لگتا ہے یہاں تیسری جنگ عظیم چھڑی ہے۔" قریشہ مسہری اور کمرے کی حالت دیکھ کر تبصرہ کیے بغیر نہ رہ سکی سب نے امید کے بالوں سے ٹپکتے پانی کے قطروں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔

"امید یہ تمہاری گردن کو کیا ہوا ہے۔" اقرا کے کہنے کی دیر تھی سب اس کے پاس کھسک آئیں۔

"اصل میں۔" وہ آنسو پیتے ہوئے زبردستی مسکرائی اس "اصل میں" کے بعد اس نے مطمئن کرنے والا جھوٹ بولا جس سے وہ پرسکون ہو گئیں ازل ناشتا کرنے کے بعد باہر چلا گیا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ اسے شاہ ولا لے آئیں یہیں شام کو ولیمہ کی تقریب ہونی تھی وہ آتے ہی پڑ کر سو گئی تھی عظمیٰ بیگم کے سر سے جیسے کوئی بھاری بوجھ سرک گیا تھا سب سمجھ رہے تھے کہ وہ سو رہی ہے وہ تو کمرا بند کیے اپنی حسرتوں کا ماتم کناں تھی۔ محبت کرنے کی اتنی بھیانک سزا ملے گی اس نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا۔

شام چار بجے کے قریب بیوٹیشن اسے دوبارا تیار کرنے آئی امید کل سے بڑھ کر آج حسین لگ رہی تھی سوگواریت میں رچے حسن کی شان دوبالا ہو گئی تھی۔ ازل سب سے مبارکباد وصول کر رہا تھا۔ سب مہمان رخصت ہوئے تو ازل نے بھی سب سے اجازت چاہی امید کا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ یہیں رک جائے سب نے ہنستے مسکراتے انہیں رخصت کیا ازل خود گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

وہ کپڑے بدل کر ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو وہ کمرے میں موجود تھا اس نے بھی سوٹ اتار کر کرتا شلوار پہنا ہوا تھا ازل نے دروازہ لاک کیا تو اس کا دل دھڑک دھڑک کر باہر آنے کے جتن کرنے لگا اس نے ٹیوب لائیٹ آف کر کے نائیٹ بلب جلایا تو اس کا جی چاہا ہوش و خرد سے بیگانی ہو جائے ازل نے اسے مخاطب کیا۔

"مرد کو اللہ نے قدرتی طور پر مضبوط اور عورت کے حقوق کا محافظ بنایا ہے شرعی رشتے میں بندھ کر محض ایک شب میں تمام حجاب اٹھ جاتے ہیں میں جانتا ہوں تم ہوس کی ماری لڑکی ہو بھلا تم محبت جیسے نازک جذبے کو کیا جانو اگر تجھے اپنے حقوق کا محافظ بنانا چاہتی

ہو تو اپنا حق مجھ سے مانگو روؤ گڑگڑاؤ بصورت دیگر تاقیامت محروم رہو گی۔" وہ دم سادھے اسے بولتا دیکھ رہی تھی ایسی تذلیل اور توہین کا اس نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

"فار گاڈ سیک لیومی الون ہم پلیز۔" اس نے تڑپ کر فریاد کی۔

"کیا یہاں اکیلی رہنے کے لیے آئی ہو نہیں بلکہ—" وہ تمسخرے بول رہا تھا امید نے اس کے زہریلے الفاظ سے بچنے کے لیے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں چند لمحے وہ اسے دیکھتا رہا اور کل کی طرح دوبارہ دوسرے بیڈ روم میں سو گیا۔

صبح وہ شاہ ولا آگئی یہاں دو دن سکون سے گزرے وہ اس کی زبان کے زہریلے تیروں سے محفوظ رہی واپسی پہ پھر وہی ڈراما شروع ہو گیا وہ بڑے ضبط و حوصلے سے اس کے وار سہہ رہی تھی۔ یونہی ڈیڑھ ماہ گزر گیا زندگی یکسر آگ کا دریا لگنے لگی تھی۔

——*

وہ اسے کچوکے لگانے سے باز نہیں آتا تھا ذرا اچھے کپڑے پہن کر نک سک سے تیار ہوتی تو کہتا کہ مجھے رجھانے کے لیے تم نے یہ سب کیا ہے صبح ناشتے کے لیے اسے جگاتی تو کہتا کہ ادائیں دکھا رہی ہو اس کے کپڑے پریس کرتی یا اس کی چیزوں کا دھیان رکھتی تو کہتا کہ تم اداکاری سے مجھے گھائل کرنا چاہتی ہو۔ اس نے شکر کیا جب اس کا کالج کھلا اب وہ کتابوں میں سر دیئے اس کے طنز و تحقیر سے بچنے کی کوششیں کرتی۔

اس رات وہ کتابیں لے کر جیسے ہی بیٹھی وہ آگیا وہ اسٹڈی روم یا لاؤنج میں بیٹھ کر پڑھتی وہ بھی شاید کوئی کتاب لینے آیا تھا امید کو پتا تھا رات کو مطالعہ کیے بغیر وہ سوتا نہیں تھا وہ سر جھکا کر تندہی سے قلم نوٹ بک پر گھسنے لگی۔

"خواہ مخواہ بینائی کتابوں پر ضائع کر رہی ہو نظروں کے تیر مجھ پر چلاؤ تو بات بن جائے گی۔" وہ بڑے دوستانہ لہجے میں بول رہا تھا امید نے سنی ان سنی کر کے صفحہ پلٹا تو وہ اس کی پشت پر جھانک کر اس کا لکھا دیکھنے لگا اس کا پہاڑ سا ناقابل تسخیر وجود امید پر جھک آیا اڑنٹی کی سحر انگیز مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی اس نے بمشکل بکھرے حوصلوں کو جمع کیا اتزل کے سحر سے بچنا آسان تو نہیں تھا۔

——*

جمعے کا دن تھا امید نے غسل کر کے ظہر کی نماز ادا کی اور سورت کہف پڑھنے لگی خدا کے حضور جھک کر اسے بہت سکون ملا شام سو کر اٹھی تو وہ کافی فریش تھی ذہن پر دباؤ بھی نہیں تھا، تائی اماں کا فون بھی آیا تھا انہوں نے اسے چکر لگانے کی ہدایت کی تو اس نے فوراً" پروگرام سیٹ کر لیا اور تیار بھی ہو گئی اس نے آرائش میں اہتمام سے کام لیا تھا آنکھوں میں کاجل لگا کر بانہوں میں چوڑیاں پہنی تھیں شاہ ولا کی طرف جاتے ہوئے وہ یوں ہی ہلکی پھلکی ہو جاتی تھی۔

اتزل آفس سے لوٹا تو وہ بے قراری سے چکر کاٹ رہی تھی اس نے جان کر نہیں پوچھا کہ کہیں جانا تو نہیں ہے وہ خود ہی بول پڑی۔

"مجھے تائی اماں کی طرف چھوڑ دیں"

"کیوں۔" اتزل نے اس کا سراپا جانچا اس کیوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا چائے پینے کے بعد اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ہارن بجانا شروع کیا امید دروازے لاک کر کے آگئی رات کھانے کے بعد تائی نے بیٹے اور بہو کو روک لیا امید بہت خوش تھی قید سے رہا ہونے کا احساس تھا تب ہی تو سونے کے لیے جاتے ہوئے اس کے قدم من من بھر کے نہیں ہو رہے تھے خلاف توقع وہ جاگ رہا تھا اس کی نظریں دروازے کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں وہ صوفے پر جیسے ہی لیٹی وہ اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

"بیوی ہو تم میری مگر بیویوں والی کوئی ادا نہیں ہے تم میں، یہ گز بھر کی چادر لپیٹے رہتی ہو جیسے میں نامحرم ہوں۔" اتزل نے اس کے اوپر پڑی چادر اتار کر پھینک دی وہ پریشان ہو گئی۔

"میں نے تمہارے اس حسن کو خراج تحسین بھی پیش نہیں کیا کبھی حالانکہ تم اچھی خاصی فتنہ ہو۔" اتزل کی نظریں اس کے آرپار ہونے لگیں۔

"میں بھی بہک سکتا ہوں اگر بہکنے کا سامان کرو۔" اتزل اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا بازو تھام لیا۔

"مت ہاتھ لگائیں مجھے۔" وہ تڑپ ہی تو گئی۔

"تمہاری ڈائریاں پڑھ چکا ہوں یہ اداکاری فضول ہے۔ ویسے بھی اب تم میری ملکیت ہو۔" اتزل نے اس کا ضبط آزمانے کو ملکیت جتانے کا عملی طریقہ استعمال کیا۔ وہ چیخ پڑی۔

"دور رہیں مجھ سے، مت میرے قریب آئیں۔" وہ چیختی چلی گئی، دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی اتزل گھبرا گیا امید نے بھاگ کر دروازہ کھولا، سامنے تائی اماں کھڑی تھیں۔

"تائی اماں یہاں کچھ ہے، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں اپنے بیڈ روم میں سوؤں گی۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔

دوسرے روز امید نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا مگر تائی جان نے محبت سے اسے بھیج دیا۔

——*

اتزل نے اسٹور روم کا دروازہ بھڑا ہوا دیکھا تو لاک کر دیا۔ وہ چار پانچ روز کے لیے شہر سے باہر جا رہا تھا۔ چوکیدار شیر خان کو گھر کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد شیر خان نے گھر کا چکر لگایا تو سب لائٹس اندھیرا ہونے کے باوجود آف تھیں۔ وہ سمجھا کہ بیگم صاحبہ بھی نہیں ہیں۔ وہ مزے سے گیٹ لاک کر کے اپنے کوارٹر میں جا کر سو گیا۔

امید اسٹور روم میں سب چیزیں ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ یہ اسٹور روم تہ خانے میں تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد وہ فارغ ہو کر نکلنے لگی تو دروازے کو لاک پایا۔ اتزل نے شاید یہ سمجھا تھا کہ اندر کوئی نہیں ہے اس لیے دروازہ بند کیا تھا۔ امید کو خبر ہی نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارا۔ یہ وہی وقت تھا جب شیر خان اپنے کوارٹر میں آرام کے لیے جا چکا تھا۔ اس تک خاک امید کی آواز پہنچتی۔ رو رو کر اس کا حلق خشک ہو گیا۔

قریشہ مسلسل تیسرے روز بھی امید کا نمبر ڈائل کرتی رہی مگر وہاں سے کوئی فون اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ ان سب نے پروگرام بنایا کہ خود ہی چلے چلتے ہیں۔ شیر خان اپنے کیبن میں تھا۔

"یار گیٹ تو کھولو۔" عدی نے ہارن دیا تو اس نے حکم کی تعمیل کی۔ گاڑی رکتے ہی وہ ان کے قریب آیا۔

"صاحب بڑا صاحب تو شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ آپ کی طرف ہیں۔"

"دگھاس تو نہیں چر گئے ہو۔ بیگم صاحبہ ہماری طرف ہوتیں تو ہم یہاں کیوں آتے اور یہ گھر کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں ایسے چھوڑ کر وہ جا سکتی ہیں۔ ہمیں تو تم پر شک ہو رہا ہے۔" اتنے میں قریشہ اور اقرا اندر چلی گئیں۔ دروازے یوں ہی بند ہوئے تھے۔ سب سامان بھی جوں کا توں تھا، پر وہ نہیں تھی۔ دونوں کا دل انجان سے خدشے سے کانپا۔ سامنے ٹیبل پر چابیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اقرا نے اسٹور روم کا دروازہ لاک دیکھا تو چابی تالے میں گھمائی۔ دروازہ کھلنے پر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ زور زور سے چیخنے لگی۔

"قریشہ، بولی، عدی جلدی آؤ۔"

"الٰہی خیر۔" ان کے دل دہل گئے۔ امید کو دیکھتے ہی قریشہ کا بھی وہی حال ہوا۔ عدی اور بولی نے ہمت سے کام لیا۔ دروازے کے ساتھ ہی وہ مڑی تڑی پڑی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور نبض رک رک کر چل رہی تھی۔ انہوں نے وقت ضائع کیے بغیر شاہ ولا فون کیا اور اسے ہاسپٹل لے گئے۔ شیر خان رو رو کر صفائیاں پیش کر رہا تھا کہ اسے کچھ پتا نہیں ہے۔ فواد شاہ امید کی یہ قریب المرگ حالت دیکھ کر پریشانی سے ہاسپٹل کے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ چوتھے دن اسے ہوش آیا تھا۔ ڈرپ لگی ہوئی تھی ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اگر آپ ایک گھنٹہ بھی لیٹ آتے تو مریضہ کا بچنا محال تھا۔ اس کا یہ حال خوف و تنہائی، بیچارگی اور نقاہت کی وجہ سے ہوا تھا۔ جونہی ڈاکٹرز نے کہا کہ اب آپ اسے مل سکتے ہیں، وہ سب بے تابی سے اندر داخل ہوئے تھے۔

"بیٹا اب کیا حال ہے۔" فواد دلسوزی سے بولے۔ وہ ابھی مکمل طور پر کسی کو پہچان نہیں رہی تھی۔

"ازل مجھے مار دیں گے۔ میں اب اور نہیں جی سکتی، قسم خدا کی وہ مجھے مار دیں گے۔ مجھے بچالیں، میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔" وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنی نازک جان پر ٹوٹنے والا ہر ستم بتاتی چلی گئی۔ وہ بھی جو اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ ہوش و حواس میں تھی ہی کب، جو ایسی نزاکتوں کا اسے دھیان ہوتا۔

--*

"میں نے تو تمہیں انسانی دودھ پلایا تھا۔ یہ درندوں والے اوصاف کہاں سے آگئے تم میں، تم نے اس لڑکی پر کون کون سا ظلم نہیں ڈھایا، مجھے شرم آرہی ہے۔ میں نے پیدا ہوتے ہی تمہارا گلا کیوں نہ دبا دیا۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

وہ آج پندرہ روز کے بعد لوٹا تھا، آتے ہی اس عجیب صورت حال سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ وہ چپ چاپ ماں باپ کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

"اب وہ کہاں ہے۔" اس نے باپ کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"مر گئی ہے وہ، یہی چاہتے تھے ناں تم، اب آئندہ تمہاری زبان پر اس کا نام نہ آئے۔ مجھ سے، اس گھر سے اور اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ روز حشر میں بھائی اور بھابھی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اب مہربانی کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔" فواد رکھائی سے بولے۔

بعد میں ازل نے کتنی بار معافی مانگی، اس معاملے میں اپنے بے قصور ہونے کا اعتراف کیا۔ پر فواد کا دل نرم نہیں ہوا اور امید کی طرف سے بھی ازل کو پریشانی تھی۔ فواد نے تو لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ "میں بہت جلد اس کی شادی کر دوں گا۔ وہ اس گھر سے جیسی گئی تھی ویسی ہی ہے۔ کوئی بھی اچھا گھرانہ اسے قبول کر لے گا۔" وہ حیران ہوا کہ انہیں کیسے پتا چلا کہ ازل کا اس کے ساتھ یہ رویہ تھا۔ اس کے بعد اسے ماں باپ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی، ہاں اس نے اتنا ضرور کہا تھا۔ "میں امید کو کسی قیمت پر بھی آزاد نہیں کروں گا۔"

"میاں صاحبزادے عدالت میں آنا۔" وہ کہیں سے بھی ایک مشفق باپ نہیں لگ رہے تھے۔ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ سے گھبرا کر وہ امید سے بدلہ لینے لگا تھا۔ بدعہدی کا ناگ ڈسے جاتا تھا۔ وہ روشان کی نگاہوں سے گر گیا تھا۔ گھر والوں کی نگاہ میں بے اعتبار ٹھہرا تھا۔ باپ نے تو اسے بددیانت اور منافق تک کہا تھا اس نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی، اب انا پہ یوں چوٹ پڑی تو بلبلا اٹھا مردانگی کا سارا غرور خاک میں مل گیا جب روشان اسے انگوٹھی واپس کر گئی تو وہ فوراً اس کے پاس پہنچا۔

"روشان تم غلط فہمی کا شکار ہو۔ میری ساری کمٹمنٹ تمہارے ساتھ ہے۔ وہ لڑکی اپنے رویے کی خود ذمہ دار ہے۔" اس نے رسان سے اسے سمجھانا چاہا۔

"غلط فہمی کا شکار میں پہلے تھی اب روشنی میں آگئی ہوں۔ تم شیخوپورہ میں بھی ہر وقت اس کا ذکر کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ دور رہ کر بھی تمہارے پاس ہے۔ اس وقت وہ بچی تھی تو تمہاری محبت کا یہ حال تھا اب تو وہ بڑی ہو گئی ہے۔ بے شک تم سے کافی چھوٹی ہے پر ہے تو خوبصورت۔ میری اگر تمہارے ساتھ شادی ہو جاتی تو میں جل جل کر ہی مر جاتی۔ وہ میری رقیب ہے، سمجھے، میں محبت میں شراکت برداشت نہیں کر سکتی اور وہ جو دیوانوں کی طرح تمہیں چاہتی ہے تم نے خود منگنی کے بعد اعتراف کیا تھا کہ یوں لگ رہا ہے جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز اسے مار رہی ہے، وہ تم سے کترائی کترائی رہتی ہے۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتی ہے۔ کتنا دکھ تھا ناں تمہیں اس بات کا کہ وہ تمہیں ہاسپٹل دیکھنے نہیں آئی ہے اور جب میں خود تمہارے گھر آئی ہوئی تھی۔ اس نے جیسے جنون کے عالم میں اپنی اور تمہاری تصویر پھاڑی تھی۔ اس نے سوئیٹر نہیں پہنا تو تم اس کے پاس پہنچ گئے اپنی جیکٹ لے کر۔ تم اچھی طرح جان گئے تھے کہ وہ اپنے رد عمل کا اظہار کر رہی ہے۔ تمہاری زندگی میں کسی اور کا شامل ہونا اسے گوارا نہیں ہے۔ اس کی ڈائری کا ورق ورق اس کی جنونی محبت کا گواہ ہے۔ ماں باپ کی وفات کے بعد تم ہی اس کے سب سے زیادہ قریب تھے، تبھی تو تمہارے گھر والوں نے اس کے پاگل پن کا توڑ کرنے

کے لیے اسے ہوسٹل بھجوا دیا۔ یہی ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ اس کے احساسات میں تبدیلی کی بہت بڑی لہر آئی۔ سینئر کیمبرج کرتے ہوئے۔" اس نے ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

"ازل نے مجھے آخری بار شیخوپورہ جاتے ہوئے جو ٹراکس دلوائے تھے، وہ ڈھائی سال پہلے ہی چھوٹے ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کی ایک ایک چیز کو سنبھال کر رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے بالوں کی جو لٹ مجھے بہلانے کے لیے کاٹ کر دی تھی، وہ میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ مجھے پتا ہے اسے جلانے سے وہ آ نہیں جائیں گے اس لیے میں نے اسے رکھ دیا ہے۔ ایگزامز میں صرف ایک ماہ رہ گیا ہے اس کے بعد میں واپس چلی جاؤں گی اور ان سے میری ملاقات ہو گی۔ پتا نہیں اب میں پہلے کی طرح ان سے مل پاؤں گی کہ نہیں۔ میرا قد پانچ فٹ دو انچ ہو گیا ہے۔ میں اب بھی کبھار دوپٹہ بھی گلے میں ڈال لیتی ہوں۔ میرے بال کمر تک آ گئے ہیں۔ جب میں ان سے ملوں گی تو بال کھول لوں گی۔ میری فرینڈ صنوبر کہتی ہے کہ کھلے بالوں میں، میں بہت اچھی لگتی ہوں۔"

"تو ازل شاہ اسے اپنے ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔" یہ ایک جوان ہوتی لڑکی کی سوچیں تھیں اور جب وہ تم سے ملی تو اس دن کا اس نے یوں احوال لکھا ہے۔ "مجھے یوں لگا کہ میں جیسے چار صدیوں کے بعد انہیں دیکھ رہی ہوں۔ میرے اندر ہمت ہی نہیں ہوئی کہ چھ سات سالہ بچی کی طرح بھاگ کر ان کے گلے لگ جاؤں۔ وہ بھی جھجک گئے تھے۔ میں اب چھوٹی تو نہیں تھی ناں کہ وہ بے تابی کا اظہار کرتے۔ رات کو وہ میرے کمرے میں آگئے۔ مجھے ایکدم ان سے بے تحاشا شرم محسوس ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرا اندر پڑھ رہے ہیں۔"

"ازل اس نے تمہارے لمحے لمحے کا حساب رکھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمہارے لیے مناسب ترین ہے۔" روشان بولی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"کسی نے مجھ سے بھی پوچھا ہے کہ تمہاری کیا رائے ہے، خود ہی نتائج اخذ کیے جا رہے ہیں۔ میرے لیے بس وہ ایک بچی ہے، دیٹس آل" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"ازل وہ بچی اب بڑی ہو گئی ہے۔ تمہاری شخصیت میں اس کے لیے بے پناہ اٹریکشن اور پراسراریت ہے۔ الف لیلوی داستانوں کی طرح مجھے امید ہے کہ تم اس کے ساتھ خوش رہو گے۔"

"روشان کچھ بھی ہو مجھے تمہارے ساتھ ہی شادی کرنی ہے۔" وہ مضبوطی سے بولا۔

"مگر میں نے تمہارے ساتھ نہیں کرنی، اب تو بالکل نہیں۔" اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"روشی تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو، میں اس کے لیے یوں نہیں سوچ سکتا۔ فرض کیا سوچ بھی لوں تو وہ میرے احساسات کی تہ تک نہیں پہنچ سکے گی۔ میری شخصیت میں شاید اسے اپنا باپ نظر آتا ہے، اس کی محبت میں بھی یہ رنگ نمایاں ہو گا۔ کتنی آکورڈ صورت حال ہو گی، میں بہ حیثیت ایک شوہر کی نظر سے اسے دیکھ ہی نہیں پاؤں گا۔"

"ہر لڑکی کا آئیڈیل اپنے باپ کی خصوصیات سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ وہ آئیڈیل میں اپنے باپ والی خوبیاں دیکھنا چاہتی ہے اور امید کا باپ تو اس کے عالم ہوش سے پہلے ہی وفات پا چکا تھا۔ تم ہی اس کا آئیڈیل ہو اور شادی کے بعد وہ خود بخود تمہارے احساسات کی تہ تک پہنچ جائے گی۔ تم اسے ایک مرد کی نظر سے دیکھو تو تمہیں علم ہو گا کہ اس کی ذات میں بہت متوجہ کرنے والی کشش ہے۔ اسلام میں منہ بولے رشتوں کی حقیقت نہیں ہے۔ منہ بولے بھائی، ماموں، چچا سے شادی حرام نہیں ہو جاتی۔ تم صرف اس کے کزن ہو۔ وہ بہت پاگل سی لڑکی ہے۔ ہو سکتا ہے ناکامی میں آ کر کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا لے۔ تم اسے دکھ میں نہیں دیکھ سکتے لکھوا لو مجھ سے۔" وہ اس کی کوئی بات بھی نہیں سن رہی تھی پھر ازل نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے ازل کو توڑ پھوڑ دیا، اس کی جون ہی بدل ڈالی۔ اس نے امید کے خیالی ہیولے سے وعدہ کیا کہ اسے اب مرد بن کر دکھائے گا۔ وہ مرد جس سے امید جیسی بے وقوف لڑکی شدید محبت کرتی ہے۔ وہ دیکھے گا کہ وہ اسے

کس حد تک قبول کرتی ہے۔ اس نے امید کو قبول کرلیا تھا۔ روشان کے کہنے کے مطابق اسے خالصتاً مرد کی نظر سے دیکھا تھا۔

برائیڈل ڈریس میں ملبوس قیمتی جیولری پہنے پھولوں سے مزین پرفیوم اور مہندی سے آراستہ وہ یقیناً اسی کے لیے سجی تھی۔ اس کی خوبصورتی کو وہ شروع سے دیکھتا آرہا تھا۔ آج اس کے شعلہ سامان فتنہ انگیز حسن کی چھب ہی نرالی تھی۔ یقیناً وہ کسی بھی زاہد خشک کی برسوں کی ریاضت کو پانی کرسکتی تھی۔ ابھی بہاروں کا سفر مکمل نہیں ہوا تھا تو یہ حال تھا بعد میں جانے کیا ہوتا۔ اترل کے اندر جیسے کسی درندے کی روح حلول کرگئی تھی۔ اسے اپنی پارسائی و مضبوطی پر بہت ناز تھا۔ اس کی ہستی کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ اس نے جب غصے سے اس کی گردن دبوچی تو اسے بالکل بھی ملال نہیں ہوا۔ اسے جلا کر، ستا کر اترل کی مردانگی کو بڑا سکون ملتا۔ وہ اس پہ حاوی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا استحقاق پہلی بار استعمال کرنا چاہا تو اس کی طرف سے شدید ری ایکشن ہوا۔ فخر و ناز کا بت دھڑام سے گرا تھا۔ اترل کے اس رویے سے وہ ہرٹ ہوگئی تھی۔ آج وہ سود و زیاں کرنے بیٹھا تو احساس ہوا کہ وہ اسے توڑ پھوڑ کر غائب ہوگئی ہے۔ سات مہینے ہوگئے تھے اسے گئے ہوئے۔ شاہ ولا کے دروازے اترل پر بند ہوگئے تھے۔ اترل کے وجود کو وہ جیسے گرم گرم پچھتاووں کی بھٹی میں دھکیل گئی تھی۔ جہاں وہ دن رات جل رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس نے امید کے ساتھ اتنی سنگ دلی سے کام لیا ہے۔ خیالات تو اس کے بدل ہی چکے تھے۔ وہ اب ازالہ کرنا چاہتا تھا جس کی صورت فی الحال دور دور تک نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

*_*_*

جب بھی رات کو گھر آتا ہوں
اپنے دروازے پہ دستک دیتے لمحے
اکثر میری سوچ یہ مجھ سے کہتی ہے
آج تو دروازہ کھولے گی
مجھ کو دیکھ کے مسکائے گی
میرا ماتھا چومے گی
شرمائے گی
گھر میں داخل ہوتے ہی
میں بھی کوئی شرارت کردوں گا
تو خود میں سمٹ کر رہ جائے گی
میں بھی کتنا پاگل ہوں ناں
کیا کیا سوچا کرتا ہوں

آفس سے آتے ہی اس پہ بے چینی سوار ہوگئی۔ ہمیشہ کی طرح شیر خان نے گیٹ کھولا تھا۔ گھر کے کام کاج کے لیے اس نے ادھیڑ عمر کل وقتی ملازمہ رکھی تھی۔ فریش ہوتے ہی وہ اس کے لیے چائے لے آئی۔ اسے امید یاد آگئی، جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ جب وہ اسے چائے پیش کرتی تو پیالی اس کے ہاتھ میں لرز رہی ہوتی تھی۔ جیسے وہ گرم گرم چائے اس کے اوپر پھینک دے گا۔ وہ اتنا ظالم جو ہوگیا تھا۔ کم عمری کے باوجود اس میں شدید احساس ذمہ داری تھا۔ وہ اس کے کپڑوں، جوتوں، چائے، کھانے پینے کا خاص دھیان رکھتی۔ نئی دلہن ہونے کے باوجود وہ اسے کہیں بھی گھمانے پھرانے نہیں لے کر گیا اور نہ اس نے فرمائش کی۔ رات وہ کبھی ایکدم جو اس کے کمرے میں چلا جاتا تو وہ خوفزدہ ہرنی کی مانند ہو جاتی۔ رنگ زرد پڑ جاتا۔ ایسے میں اترل کو بڑا لطف آتا۔

چائے پیتے ہی وہ گاڑی لے کر نکل آیا۔ یوں ہی بے دھیانی میں وہ شہر سے کافی دور نکل آیا تھا۔ ایک صاف ستھری پختہ سڑک کے کنارے بورڈ لگا ہوا تھا۔ "کرنل خان فارمز" یہ کسی کی ذاتی سڑک تھی۔ وہ گاڑی موڑنے لگا۔ آگے سے اور گاڑی آرہی تھی۔ گاڑی یوں ہچکولے کھا رہی تھی جیسے اناڑی ڈرائیور کے قبضے میں ہو۔ اسے یوں لگا کہ وہ کسی بھی وقت الٹ کر کھیت میں گھس سکتی ہے یا اس کی گاڑی کے ساتھ ٹکرا سکتی ہے اور ہوا بھی یہی۔ گاڑی مست ناگن کی طرح لہراتی سبزیوں کے کھیت میں گھس گئی۔ ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔ گاڑی کا ڈرائیور باہر نکلا وہ دو لڑکیاں تھیں، اترل کی طرف ان کی پشت تھی۔ وہ دونوں پیچھے مڑیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کو دیکھ کر زمین آسمان

جیسے پوری قوت سے اس پر آپڑے۔ وہ سوفی صد امید تھی۔ اترل نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور تیز رفتاری سے اس کی طرف بڑھا۔

"امید کہاں غائب ہوگئی تھیں۔ میں نے تمہیں ہر جگہ تلاش کیا ہے۔" اس نے سختی سے اسے دونوں شانوں سے تھام لیا۔ وہ دونوں چیخنے لگیں۔

"چھوڑ دو مجھے، یہ تو کوئی پاگل لگتا ہے۔ پلیز ہیلپ می۔" اس کی آواز دور دور تک گونجتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ دو خوفناک صورت اسلحہ بردار اس کے سر پر آپہنچے۔

"چھوڑ دو بی بی کو۔" دونوں کے ہاتھ شانوں پر لٹکی گن کی طرف بڑھے۔

"تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔" اترل نے پروا کیے بغیر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ سرد سی گن کی نال اس کے سر سے آلگی۔ اس نے بے اختیار گہری سانس لی۔ وہ اسے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"کون ہو تم اور کرنل صاحب کی جاگیر میں بلا اجازت کیوں گھسے ہو۔" گن بردار اس کی قیمتی گاڑی اور کپڑوں سے متاثر نہیں ہوا تھا۔

"یہ میری وائف ہے۔ میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔" وہ پوچھ گچھ کو خاطر میں ہی نہیں لایا۔

"وائف۔۔۔ ہوش میں تو ہیں آپ، چندا کی تو ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی ہے۔" دوسری لڑکی کڑک کر بولی۔

"چندا ان کی شکل ہو بہو میری وائف سے مل رہی ہے۔ کہیں تو آپ کو تصویر دکھا دوں۔ میری پاکٹ میں موجود ہے۔" وہ جیب ٹٹولنے لگا۔ ان چاروں افراد نے بڑے اشتیاق سے تصویر دیکھی۔ وہ لڑکی چندا تو بہت حیران ہوئی۔ بیلا نے وہیں کھڑے کھڑے اس ٹریجڈی کا سیاق و سباق پوچھ لیا۔

"آئیں آپ کو اپنے انکل اور چندا کے ڈیڈی سے ملواؤں۔ وہ بہت حیران ہوں گے۔" وہ پس و پیش کیے بنا ان کے ساتھ ہولیا۔

کرنل خان بڑے صحت مند ریٹائرڈ آفیسر تھے۔ عادت کے مطابق بہت جلد اس سے بے تکلف ہوگئے۔ انہوں نے بتایا کہ چندا ان کی اکلوتی اولاد ہے۔ بیلا ان کے بھائی کی بیٹی تھی۔ ماں نہیں تھی۔ باپ فرانس میں تھا اپنی انگریز بیوی کے ساتھ۔ کرنل خان نے ہی اسے پالا تھا۔ بیلا کی طرح چندا کی ماں بھی نہیں تھی۔ چند روز میں ہی وہ اس گھرانے کے بے حد قریب ہوگیا۔ چندا کی ساری عادات کم و بیش امید سے ملتی جلتی تھیں۔ وہی بے صبری و جلد بازی، قدرے احمقانہ سی خود سری۔ اترل کو پورا یقین تھا کہ وہ امید ہی ہے۔ اسے چندا کو یہی باور کراتا تھا۔ بظاہر تو اسے اترل کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا افسوس تھا۔ وہ اسے امید کو تلاش کرنے کے نئے نئے مشورے بھی دیتی۔

وہ اکثر چلا جاتا۔ کرنل خان کے ساتھ شطرنج کی بازیاں بھی ہوتیں۔ بیلا کے ہاتھ کی بنی نئی نئی ڈشز بھی چکھنی پڑتیں۔ وہ اکثر ان دونوں کے ساتھ رائیڈنگ کے لیے چلا جاتا۔ چندا آج نئے آنے والے گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ اس نے ابتدا ہی سے اپنے سوار کو کینہ توز نگاہوں سے گھورا اور سرپٹ دوڑ پڑا۔ بیلا کے تو حواس ہی ساتھ چھوڑ گئے۔

"پلیز اترل صاحب کچھ کریں، راکی اسے گرا دے گا۔" اترل نے فوراً اپنے گھوڑے کو اور بھی تیزی سے دوڑانا شروع کردیا۔ بیلا اور اس کا گھوڑا بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ چندا مسلسل چیخ رہی تھی اسے اپنی موت کا سوفی صد یقین ہوچکا تھا۔ سڑک کے بعد شروع ہونے والا پل ٹوٹا ہوا تھا۔ گھوڑا لحہ بہ لحہ ٹوٹے پل سے قریب ہوتا جارہا تھا اس نے کلمہ پڑھا اور آنکھیں بند کرلیں اترل نے اپنا گھوڑا اس کے گھوڑے کے قریب کیا اور پھر رسک لیتے ہوئے اسے جھٹکے سے راکی کی پیٹھ سے اتار لیا۔ وہ اب اس کے گھوڑے پر آچکی تھی۔ اترل نے نرمی سے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپائی۔ وہ فوراً رک گیا۔ چندا اس کے سینے سے لگی کانپ رہی تھی۔ اس کا تنفس ابھی تک معمول پر نہیں آیا تھا۔

"ایزی، امید آنکھیں کھولو تم بالکل محفوظ ہو۔" پھر اترل نے نوٹ کیا کہ وہ اس کے امید کہنے پر بالکل نہیں چونکی۔ اتنے میں بیلا بھی آگئی۔ وہ جھینپ کر گھوڑے

سے اتر گئی۔
"تھینکس گاڈ! تم زندہ ہو۔ اگر اترل نہ ہوتے تو جانے کیا ہوتا۔" وہ ممنون نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"میں نے تو اپنی امید کو بچایا ہے۔" وہ ذو معنی انداز میں بولا۔
"پر یہ کسی اور کی امید ہے۔" بیلا مسکرائی۔
"بات ایک ہی ہے۔" وہ بولا تو اس نے بحث کا سلسلہ ملتوی کر دیا۔
اس روز وہ خان فارمز پر آیا تو کرنل خان اور چندا دونوں نہیں تھے۔ ملازم نے بتایا کہ "چھوٹی بی بی سو رہی ہیں۔"
"کوئی بات نہیں میں انتظار کر لیتا ہوں۔" وہ میگزین اٹھا کر نشست گاہ میں ٹک گیا۔ ویسے اسے اس کے سونے پر حیرت ہو رہی تھی۔ مغرب ہونے والی تھی۔ موسم بھی اچھے تیوروں والا نہیں تھا۔ بادلوں نے ویسے ہی اندھیرا کر رکھا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد سوئی سوئی خمار آلود آنکھوں کو ملتی وہ وہیں آگئی' بال بھی یوں ہی بکھرے ہوئے تھے۔
"ڈیڈی تو گھر پر نہیں ہیں۔ بیلا بھی ان کے ساتھ گئی ہے' دیر سے آئیں گے نو بجے کے بعد۔"
"آپ تو ہیں ناں۔" وہ اس کے بے نیاز سراپے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ اتنے میں بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ وہ چائے کا کپ اٹھا کر دریچے کے پاس آگیا۔ بہت دیر دونوں میں خاموشی رہی پھر اترل بولا۔
"میری کہانی سنیں گی۔" وہ نظریں موڑے بغیر بولا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"میں نے اسے پہلی بار جھولے میں دیکھا تھا۔ میں نے اس کے گال چھوئے تو وہ مسکرائی۔ مجھے اس کے گلابی پتلے پتلے ہونٹ' پھولے پھولے رخسار' موٹے ہاتھ پاؤں اور ننھا سا وجود بہت غیر معمولی لگ رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ حالانکہ مجھے بچوں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ کالج میں نیا نیا آیا تھا' واپس آتے ہی اس کے کارٹ کی طرف دوڑتا' پھر اس نے توتلی زبان سے پہلا نام میرا ہی لیا۔ میں اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے چلانے کی کوشش کرتا اور جب اس نے پہلا قدم اٹھایا تو میں نے اپنی پاکٹ منی چپکے سے خیرات کر دی۔ جب انکل اور آنٹی فوت ہو گئے تو وہ مکمل طور پر مجھ پر انحصار کرنے لگی۔ لکھنا پڑھنا سیکھا تو ٹوٹے پھوٹے خط میں پہلی دفعہ میرا نام لکھا۔ میں دیکھ کر بہت ہنسا۔ اس نے میرے نام کا حلیہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ ت کے بجائے ط سے میرا نام لکھا۔ میں خود ہی اسے اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا۔ وہاں کوئی بچہ اس سے لنچ باکس چھین لیتا' کاپی لے لیتا' کتابیں پھاڑ دیتا تو وہ میرے پاس دوڑتی ہوئی آتی حالانکہ گھر میں اور افراد بھی تھے جو اسے ٹوٹ کر چاہتے مگر وہ اپنی ہر ضرورت کے لیے میری طرف ہی دیکھتی۔ مجھے یوں لگتا اگر میں ایک پل کے لیے بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو اس کی سانسیں بند ہو جائیں گی۔ رات کو میں جب تک اسے سینے پر لٹا کر کہانی نہ سنا لیتا' اسے نیند ہی نہیں آتی۔ اگر میں بیمار ہو جاتا تو وہ بے قرار ہو جاتی پھر اسے دلہن بننے کا شوق ہوا اور کہا کہ میں آپ کی دلہن بنوں گی۔ میں ایم ایس سی کر کے سی ایس ایس کے ایگزامز کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی بات کو خاص اہمیت نہیں دی۔ اس کا دولہا بن گیا۔ اس نے اس موقع کی تصویر اپنی ٹیچرز کو بھی دکھائی۔ وہ گھر پر چلی آئیں۔ میں نے بہت انجوائے کیا شاید یہی میری غلطی تھی۔ اس کی بے پایاں محبتیں سمیٹ کر میں خود کو خدا سمجھنے لگا تھا۔ مجھے یوں لگتا کہ جیسے وہ میری تخلیق ہے' میں نے خود اس میں رنگ بھرے ہوں۔ یہ احساس ہی کتنا دلکش تھا۔ میں ہواؤں میں اڑا پھرتا پھر میں اس سے جدا ہو گیا۔ آئی مین جاب کے سلسلے میں' ہر سال عید' سالگرہ اور نئے سال کے موقع پر وہ مجھے وش کرنا نہیں بھولتی تھی۔ میرے شیخوپورہ جاتے وقت وہ بہت روئی تھی۔ میں بھی خالی خالی سا رہتا جیسے گھر پر ہی کچھ چھوڑ آیا ہوں۔ بے قراری سے فون کرتا' گھر والوں نے روک دیا وہ ڈسٹرب ہو جائے گی پھر چار سالوں کے بعد میں گھر لوٹا تو وہ آچکی تھی۔ فراک اور نیکر کے بجائے قمیص شلوار پہنی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی دو پونیوں کی

جگہ لہراتے کمر تک بال تھے۔ سب سے بڑھ کر اس کی آنکھوں کا تاثر تھا جو مجھے دیکھ کر لرزیں' جھکیں اس نے دور ہی سے میرا حال پوچھا۔ میں نے بھی اپنی بے قراریوں پر قابو پا لیا۔ ایک دن وہ بیمار ہو گئی۔ دوا ہی نہیں پی رہی تھی۔ میں نے زبردستی اسے دوا پلائی۔ اس کے قریب ہوا تو اس نے اپنا بدن چرا لیا۔ مجھے پہلی بار یوں لگا کہ جیسے وہ نامحرم ہے۔ اس کی بدن چرانے کی ادا بھرپور حیادار دوشیزہ کی سی شگفتگی سمیٹے ہوئے تھی۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔ میں نے بہت جلد اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو پکڑ لیا اور پھر بھی نظر کا دھوکا سمجھتا رہا۔ وہ پہلے کی طرح میرے پاس نہیں بیٹھتی تھی' نہ زیادہ باتیں کرتی بلکہ میری طرف تو وہ پلکیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔" بولتے بولتے وہ خاموش ہو گیا۔
پھر ایکدم وہ لہجہ بدل کر بولا۔ "امید وہ واقعہ یاد ہے جب تم نے میرے اوپر سوپ گرا دیا تھا۔"
"ہاں' آں' نن نہیں۔" وہ بالکل ہی گڑبڑا گئی۔
"میرا نام امید نہیں چندا ہے بتایا تو ہے آپ کو۔" وہ خود کو سنبھال کر بولی۔
"جتنے نام مرضی بدل لو' رہو گی تو اترل کی امید ہی' نئی زندگی کا سراغ۔" وہ دریچے سے ہٹ آیا۔ چائے کپ کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔
"میرے ساتھ چلو گی یا مجھے ہی اٹھا کر گاڑی تک تمہیں پہنچانا پڑے گا۔"
"کیا کہہ رہے ہیں آپ' ہوش میں ہیں۔ میرے ڈیڈی یا ملازموں کو پتا لگا ناں تو آپ کو گولی مار دیں گے۔"
"تم میری بیوی ہو' میں اپنی بیوی کو لے کر جاؤں گا۔ دنیا کے کسی قانون میں نہیں ہے کہ شوہر بیوی کو لے جا رہا ہو تو اسے گولی مار دی جائے۔"
"آپ نے کیا بیوی بیوی کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ میں مزید بکواس برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ غصہ ہو گئی۔

کیا سمجھے ابھی وہ کیا آداب محبت ہیں
کم کم سا لڑکپن ہے کم کم سی جوانی ہے

"بہت معصوم ہو۔ یہ نزاکتیں تمہیں گھر چل کر بتاؤں گا۔" وہ دلکشی سے مسکرایا۔
"اب آپ چلے جائیں۔" وہ اس کی بات بالکل نہیں سمجھی۔
"اچھا پھر آؤں گا تمہیں لے جانے کے لیے۔ ڈیڈی سے بھی ملوں گا اور پوچھوں گا کہ میرے اوپر اتنی بے اعتباری کیوں ہے۔"
رات بیلا کو اس نے ایک ایک بات بتا دی۔
"تھینکس گاڈ مجھے تو تمہاری کشتی پار لگتی نظر آ رہی ہے۔ انکل نے تمہیں یہاں بھیج کر بہت اچھا کیا ہے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں اٹھارہ سال کا ہونے سے پہلے ہرگز اترل کے پاس نہیں بھیجیں گے مگر مجھے تو لگ رہا ہے کہ وہ تمہیں اٹھا کر لے جائے گا۔" بیلا نے اسے گدگدی کی تو وہ شرما گئی مگر پھر فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔
"مجھے تو یہ سب خواب لگ رہا ہے۔ مجھے ان کا وہ تذلیل آمیز انداز نہیں بھولتا ہے۔"
"چھوڑو بھی اب وہ گزشتہ باتیں۔ ذرا سوچو نئے سال کا استقبال کیسے کریں۔ صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ چلو ایسا کرتے ہیں کہ اکتیس دسمبر کو ٹھیک بارہ بجے تمہیں اترل بھائی کے حوالے کر دیں گے۔ آخر ان کے بھی ارمان ہوں گے۔ ویسے بھی انہوں نے کافی سزا بھگت لی ہے۔" بیلا نے شریر نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

——*

"امید اٹھو میرے ساتھ چلو' ہری اپ۔" وہ آج پھر کرنل خان کی غیر موجودگی میں آیا تھا۔
"آپ ہوتے کون ہیں مجھے حکم دینے والے۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔
"گھر چل کر بتاؤں گا کہ میں حکم دینے والا کون ہوتا ہوں۔ مجھے ضدی لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔ کل نیا سال شروع ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سال وہ غلطیاں نہ دہرائی جائیں جو ہم کر چکے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ مل کر نئے سال کی نئی صبح کو خوش آمدید کہنا چاہتا ہوں۔" ساتھ ہی اترل نے اسے کسی ہلکی پھلکی گڑیا کی طرح اٹھا لیا۔ امید نے اپنے لمبے لمبے

ناخنوں سے اسے کھسوٹ ڈالا مگر اس نے اسے گاڑی تک لا کر ہی دم لیا۔

"دیکھ لوں گی آپ کو اگر انکل گھر ہوتے تو دیکھ لیتے، شوٹ کر ڈالتے۔ یہ ملازم بھی جانے کہاں مر گئے ہیں۔" وہ بولتی رہی مگر اترل دانت پر دانت جمائے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ شیر خان نے گیٹ کھولا اور امید کو اس کے ساتھ دیکھ کر دور سے ہی سلام جھاڑا۔ ادھیڑ عمر ملازمہ بھی ایک نئی صورت کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ اترل نے بتایا یہ تمہاری مالکن ہیں۔ وہ بے چاری دانت پیستی، مٹھیاں بھینچتی مالکن کو دیکھ کر سمجھی کہ شاید اس کی چھٹی ہونے والی ہے۔ اترل نے اسے بتایا کہ وہ رات کا کھانا تیار نہ کرے۔ وہ دونوں باہر کھائیں گے۔ وہ خیر مناتی چلی گئی۔ جانے سے پہلے مالکن نے حکم دیا کہ "میرے سامنے رہو" اترل نے کہا کہ "تم جاؤ۔" وہ کش مکش سے بچتی اپنے کوارٹر میں بھاگ گئی۔

اترل نے اندر آکر کرنل خان کا نمبر ڈائل کیا۔ ان کی موجودگی ملازم نے کنفرم کر دی۔ اس نے یہ بتا کر فون بند کر دیا کہ "وہ امید عرف چندا کو لے آیا ہے اور اس سے ساری کہانی پوچھ لے گا۔ آپ نے میرے خلاف جو کارروائی کرنی ہے کر ڈالیں۔" انہیں اترل سے اس تیز رفتاری کی امید ہرگز نہیں تھی۔ وہ ہیلو ہیلو ہی کرتے رہ گئے۔ اس نے ریسیور کریڈل سے نیچے رکھ دیا اور موبائل بھی آف کر دیا۔ اب اسے فواد شاہ کا انتظار تھا۔ اندر بیٹھا ایک گھنٹے تک ان کی راہ تکتا رہا۔

"شاید اسلحے سے لیس ہو کر آئیں۔" اس نے تلخی سے سوچا اور ساری لائٹس جلاتا باہر آ گیا۔ امید برآمدے میں اسی پوزیشن میں تھی جس میں وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا شروع سے یہی طریقہ تھا جب کسی سے ناراض ہوتی تو منہ پھلا کر بیٹھ کر ہاتھوں کے کٹورے میں چہرا تھامے آلتی پالتی مار لیتی پھر لاکھ کوئی اسے بلاتا، اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔ ہاں جب وہ تھک جاتی تو جا کر سو جاتی۔ ناراض ہونے والا منانے کے طریقے ہی سوچتا رہ جاتا۔ صبح وہ ہشاش بشاش سب سے ہنس ہنس کر بات کر رہی ہوتی۔ جیسے ناراضگی تھی ہی نہیں مگر اس وقت ایسا ہونے کا امکان نہیں تھا وہ شدید ناراض تھی۔

"آؤ اندر چلو، باہر بہت سردی ہے۔" اترل اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔

"جی شکریہ، آپ چلے جائیں مجھے جب آنا ہو گا آ جاؤں گی۔" بالکل اجنبیوں والا انداز تھا۔ اترل نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے زبردستی کھڑا کیا تو اس نے بیزاری سے ہاتھ چھڑا لیا اور دھم دھم کرتی لاؤنج میں چلی گئی۔ اترل بھی آ گیا۔

"آپ مجھ سے مت بات کریں، نہ بلائیں۔" امید نے ہاتھ اٹھا کر وارننگ دی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کھول لیا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"میں اس لیے خاموش ہوں کہ واقعی قصوروار ہوں۔" کتنی دیر بعد وہ بولا۔

"قصوروار آپ نہیں میں ہوں۔ صرف میں جانے آپ کو کیا سمجھ بیٹھی۔ شکر ہے کہ مجھے عقل آ گئی ہے۔ آپ کا بت جو بہت پہلے سے میرے دل کے معبد خانے میں سجا ہوا تھا، وہ ٹھیک آج سے ایک سال پہلے اسی روز، اسی گھر میں ٹوٹ پھوٹ گیا جب آپ نے اپنا اصل روپ دکھایا۔ آپ کے وہ لفظ میں بھول نہیں پاؤں گی جب آپ میری شکل نہیں دیکھنا چاہتے تو مجھے تلاش کیوں کر رہے تھے۔ اکیلے گھر میں بند کر کے مجھے مارنا چاہتے تھے ناں۔ پر اوپر والے کو میری زندگی منظور تھی میں بچ گئی۔ اس وقت کی اذیت، بے بسی و بیچارگی تا عمر یاد رہے گی اور آپ کی نفرت بھی۔" بولتے ہوئے اس کا لہجہ بھیگا اور نہ ہی لڑکھڑایا۔ وہ واقعی سمجھ دار ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی باتیں کرنے لگی تھی۔ محبت اور نفرت کے مابین فرق کرنا سیکھ گئی تھی۔ ناراض ناراض سی امید کو اترل نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"چھوڑ دیں مجھے، جب وہ برائیڈل ڈریس پہننے کے لائق نہیں ہوں تو محبت کے قابل بھی نہیں ہوں۔"

"تمہیں کیا پتا کہ تم تو صرف اور صرف اترل کے پیار کے قابل ہو۔ بچپن سے ہی بلا شرکت غیرے حقدار رہی ہو۔ اب بھلا میں کسی اور کی طرف کیسے دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میری جان تو تم میں ہے۔ میں نے اس اترل کو توڑ پھوڑ کر بنایا ہے۔ صرف تمہاری خاطر، تمہاری چاہتوں کے لیے، تمہاری معصومیت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ تمہارے جذبات مجروح نہ ہوں۔" اس نے نرمی سے امید کے رخسار چھوئے تو اس نے سختی سے اترل کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"مجھے نفرت ہے آپ سے۔ مت یہ ڈرامے کریں۔" وہ مضبوطی سے بولی۔

"میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو۔" اس نے بغور امید کا چہرہ جانچا۔ اس کے ہونٹ لرزے، کانپے اس نے پھر ہمت دکھائی، اس کی آنکھوں میں جیسے سیلاب امڈ آیا۔

"مجھے آپ سے، مجھے آپ سے......" وہ یوں ہانپنے لگی جیسے میلوں دور سے بھاگتی آ رہی ہو۔ وہ پوری توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک دو تین بار اس کے ہونٹ کھلے، لرزے اور آنکھوں سے سمندر بہہ نکلا۔ "مجھے آپ سے محبت ہے، محبت ہے، محبت ہے۔ سنا آپ نے، اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی مجھے آپ سے محبت ہے۔" اس نے اسی شدت سے اترل کی شرٹ کی آستین تھامی کہ ہاتھوں کی سبز سبز رگیں نمایاں ہو گئیں۔ نازک سا جسم مسلسل جھٹکے کھا رہا تھا۔ اترل نے بے قراری سے اسے خود میں سمو لیا۔

ان کے گھر کے سامنے بنے پارک میں آتش بازی اور پٹاخوں کے ذریعے نئے سال کو خوش آمدید کہا جا رہا تھا۔ دور آسمان پہ رنگ برنگی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ بارہ بج چکے تھے۔ نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ اترل نے بے جان ہوتی امید کو صوفے پر لٹا دیا۔ وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ "آتش بازی دیکھنے چلو گی۔" اس نے پوچھا تو امید نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے بھی شوق نہیں ہے۔ میں صرف تمہارے لیے کہہ رہا تھا ورنہ معافی تلافی کا اس سے بہتر موقع نہیں ہے۔ ویسے نیا سال میرے لیے بڑا مبارک ہے۔" اترل کی معنی خیز نگاہیں اس سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

*_*_*

ڈور بیل مسلسل بج رہی تھی۔ اترل نے سوئی سوئی

آنکھیں کھولیں اور بازو اونچا کر کے ٹائم دیکھنا چاہا مگر اس کے بازو پر تو امید سر رکھے سو رہی تھی۔ اس نے انتہائی نرمی سے اپنا بازو اس کے سر کے نیچے سے نکالا۔ وہ کسمسا کر دوبارہ اس کے سینے میں سر چھپانے لگی۔ ازل کو رات کے بیتے واقعات یاد آنے لگے۔ وہ کتنی مشکل سے راضی ہوئی تھی۔ اس نے ڈھیروں معافیاں مانگی تھیں۔ وہ حسین لمحات ہمیشہ کے لیے اس کی یادوں میں محفوظ ہو گئے۔ امید کا چھپنا شرمانا بھی کس قدر دل فریب تھا۔ اس کے لبوں پہ شریر سی مسکراہٹ آ گئی۔ کریمن نے آنے والوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا تھا۔ مبہم مبہم سی آوازیں آ رہی تھیں۔ امید مزے سے سو رہی تھی شاید وہ ساری عمر کی نیند آج ہی پوری کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لبوں پہ کتنی پرسکون مسکراہٹ تھی۔ ازل نے جھک کر اس مسکراہٹ میں اپنے رنگ بھرے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

فریش ہونے اور شاور لینے کے بعد جب وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو اپنے تمام گھر والوں کو دیکھ کر اسے قطعی حیرانی نہیں ہوئی۔ ہاں مگر یہ کیا وہ سب تو مسکرا رہے تھے۔ "جوان ابھی تک ناراض ہو۔" فواد نے خود اسے گلے لگایا۔ وہ حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

"بیٹا میں خود امید کو کرنل خان کے گھر چھوڑ کر آیا تھا تاکہ تم اکیلے میں بہتر فیصلہ کر سکو اور یہی مناسب تھا۔ اس کی دوسری شادی کی تو صرف میں نے دھمکی دی تھی۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی تمہارے دل میں اس کی جگہ ہے کہ نہیں۔" وہ بول رہے تھے۔ ازل ہلکا پھلکا ہو گیا اور باپ سے معافی مانگی۔ ینگ پارٹی نے اسے نئے سال اور صلح کی مبارک باد دی۔ ماحول بدل چکا تھا۔ زیادتیوں کا ازالہ ہو رہا تھا۔ لڑکیاں امید کو دیکھنے اس کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ وہ اچانک سب کو سامنے پا کر پہلے حیران ہوئی اور پھر شرمائی۔ آج اس کے چہرے پہ حقیقی خوشی اور آسودگی کا خمار تھا۔

"دلہن صاحبہ ہیپی نیو ایئر۔ پھر کہیں ازل بھائی نے گردن تو نہیں دبائی۔" اقراء رازداری سے بولی۔

"جی نہیں بلکہ انہوں نے تو۔۔۔" روانی سے کہتے کہتے وہ رک گئی۔ سب کی شریر نگاہیں اسی پہ مرکوز تھیں۔ وہ کمبل پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کریمن ناشتا تیار کر رہی تھی۔ وہ سب یوں ہی آئے تھے کریمن پہلے ایک بار چائے بنا چکی تھی۔ اب دوبارہ بنا رہی تھی۔ امید واش روم میں گئی تو سب لڑکیاں دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ فواد امید کا پوچھ رہے تھے۔ ازل اسے بلانے آیا تو وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔

"میں سب کے سامنے نہیں جاؤں گی، مجھے شرم آ رہی ہے۔" وہ برش رکھ کر مڑی۔ ازل کی محبتوں کا خمار شرم بن کر اس کے چہرے پر جھک آیا تھا۔

"انہیں شاید اعتبار نہیں آ رہا ہے۔ چل کر سب کو یقین دلا دو کہ میں کوئی ڈریکولا نہیں ہوں۔" وہ جان گئی کہ وہ اسے چھیڑ رہا ہے۔ اس نے اونہہ کیا تو ازل نے شرارت کر ڈالی۔

"یہ نیا سال میرے لیے کتنا مبارک ہوا ہے، مجھے امید لوٹا دی۔" وہ چاہت سے بولا۔

چند سیکنڈ بعد وہ تایا کے بازو سے لگی کھڑی تھی۔ فواد جان گئے کہ ازل نے جھوٹ نہیں بولا تھا کیونکہ امید کے چہرے پہ سچی خوشی چمک رہی تھی اگر وہ اسے کرنل خان کے گھر نہ بھیجتے تو ازل کے اندر شاید اس کی دبی دبی محبت کبھی بیدار نہ ہوتی۔ جدائی کے ایک ہی جھونکے نے ساری بساط الٹ دی تھی۔ وہ آج حقیقی معنوں میں سرخرو ہوئے تھے۔ طیبہ اور مبشر سے کیا وعدہ پورا ہو چکا تھا۔ محبت نے اپنا راستہ خود تلاش کر لیا تھا۔ گلابی بہاروں کا موسم دروازے پہ دستک دے رہا تھا۔ ازل اور امید کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ انہوں نے یہ دستک سن لی ہے۔ نئے سال کی اولین صبح ان کے لیے کتنی خوشیاں لائی تھی۔ یہ کوئی فواد سے پوچھتا۔؟

نبیلہ ابر راجہ

میٹرک کا رزلٹ آیا تھا حسب معمول ہادیہ نے بہت ہی اچھے نمبر لیے تھے مگر امی نے کچھ زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بس رزلٹ کا سن کر کہا بھی تو اتنا کہ۔

"تم اپنی فائیو پرسنٹ سے زیادہ مارکس لے سکتی تھیں۔" وہ پہلے بہت خوش تھی، لیکن ان کی یہ بات سن کر بجھ سی گئی۔ امی عبدالرحمٰن کے ساتھ تو ایسا نہیں کرتی تھیں۔ عبدالرحمٰن ہادیہ کا بڑا بھائی تھا۔

عبدالرحمٰن اور ہادیہ بس دو ہی بہن، بھائی تھے۔ ہادیہ جب دو سال اور وہ چار سال کا تھا تو ان کے ابو ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں زندگی کی بازی ہار گئے۔

تب سے ہنسنے، مسکرانے اور شوخیاں کرنے والی در شہوار سنجیدہ ہو گئی۔ شیراز کی جوان جہان موت کے بعد پہلے چار سال اس نے سسرال میں ہی گزارے۔ پھر حالات کو اپنے مخالف میں پا کر میکے آ گئی۔

یہاں اس کے بھائی اور بھابھیوں کی اپنی دنیا تھی۔ تب در شہوار کو پتا چلا کہ زندگی اتنی جاذب و جمیل نہیں ہے۔ اسے حالات کے ساتھ بھرپور مقابلہ کرنا ہو گا۔

عبدالرحمٰن اور ہادیہ دونوں بہن بھائی قدرتی طور پر ہی بہت ذہین تھے۔ شیراز گورنمنٹ کے ایک ادارے میں کلیدی عہدے پر فائز تھے۔ ان کی ناگہانی موت کے بعد در شہوار کو ان کے جو واجبات ملے اور شادی کے وقت اسے سسرال اور میکے کی طرف سے جو زیور ملا وہ بھی اس نے فروخت کر دیا۔ ایک معقول آمدن ہر ماہ ہونے لگی تو اس نے بھی سکون کا سانس لیا کہ اب کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کا تو خطرہ نہیں ہو گا۔ اس کی بے پناہ حساس فطرت کے لیے یہ سکون بخش احساس تھا۔

عبدالرحمٰن اور ہادیہ کو اس نے اچھے معیار کے اسکولوں میں داخل کروایا تھا۔ جس پہ دبی زبان میں اس کے ابو اور بہن، بھائیوں نے بھی اعتراض کیا مگر اس نے اپنے حساب سے سب کو جواب دے کر خاموش کروا دیا۔

گزرتے وقت نے ثابت کر دیا کہ اس کا یہ فیصلہ درست تھا۔ اس دوران دبی زبان میں ہی گھر والوں کی طرف سے شادی کا بھی اصرار کیا تھا مگر اس نے تو جیسے آنکھیں اور کان بند کر لیے تھے۔

ہاں پر بے رحم وقت نے بہت سے کانٹے بھی پاؤں تلے بچھائے تھے۔

جب عبدالرحمٰن نے پانچویں کلاس میں اسکالر شپ لیا تو بہت خوش تھا۔ مگر یہ خوشی گھر کے دیگر افراد کے چہرے پہ اسے ڈھونڈے سے بھی نہ ملی۔ بچہ تھا، بجھ سا گیا مگر در شہوار نے بہت حوصلہ بڑھایا۔

جبکہ اس کے بھتیجے نے پانچویں کلاس کا امتحان واجبی سے نمبروں سے پاس کیا۔ در شہوار کے ابو بہت خوش ہوئے۔ ایک ایک آئے گئے کو بتایا۔

ہادیہ نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ ننھیال میں ان کی حیثیت دوسرے درجے کی ہے۔ یہ احساس طاقت ور تھا کہ آنے والے برسوں میں اس کی ساری توجہ اپنی پڑھائی کے سوا ہر چیز سے ختم ہو چلی گئی۔

یہ بات اسے دکھ سے دوچار کر گئی کہ وہ جتنے بھی اچھے نمبر لیتی، امی کسی خاص خوشی کا اظہار نہ کرتیں۔ بس یہی کہتیں تم اس سے اچھے نمبر لا سکتی تھیں۔

وقت کچھ اور گزرا۔ ہادیہ نے میٹرک بھی اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اب مسئلہ کسی اچھے کالج میں ایڈمیشن کا تھا۔ اس سلسلے میں اس کا گزشتہ تعلیمی ریکارڈ و ملنے والے تعریفی سرٹیفکیٹس، شیلڈز اور ٹرافیاں بے حد معاون ثابت ہوئے۔ اس کا داخلہ شہر کے ایک معیاری کالج میں با آسانی ہو گیا۔ اس نے پری میڈیکل کے سبجیکٹ رکھے تھے۔ کیونکہ بہت سال پہلے کی سنی بات اس نے ذہن میں بٹھالی تھی۔ عبدالرحمٰن اس کے بھائی نے ایک بار کہا تھا کہ امی چاہتی ہیں ہم ڈاکٹر بنو۔

اس نے پڑھائی کو بڑی سنجیدگی سے لیا تھا، یہی وجہ تھی کہ پری بورڈ کے امتحان میں اپنی کلاس میں اس کی تیسری پوزیشن تھی۔

اس کا خیال تھا، اس بار امی لازمی خوش ہوں گی مگر

اس بار اس کے دل میں چھناکے سے کچھ ٹوٹا' جب انہوں نے سرد سے لہجے میں کہا کہ تم فرسٹ پوزیشن بھی لے سکتی تھی۔

ایف ایس سی فرسٹ ایئر کے فائنل امتحان کے بعد ضلع بھر میں ہادیہ کی ساتویں پوزیشن تھی۔

درشہوار کی وہی کیفیت تھی' وہ اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر بھی نہیں ہونے دیتی تھیں۔

ایف ایس سی پارٹ ٹو میں آنے کے بعد ہادیہ نے زیادہ محنت کرنی شروع کردی تھی۔ اس نے کالج ٹائمنگ کے بعد ایک اکیڈمی میں داخلہ لے لیا' کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ پڑھائی کے دوران کالج میں بہت سے کنسیپٹ کلیئر نہیں ہوپاتے' اکیڈمی میں روزانہ ٹیسٹ ہوتے۔

اسی دوران امتحان کی ڈیٹ شیٹ آگئی۔ تعلیمی میدان میں بہت سخت مسابقت چل رہی تھی۔ اسے میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے ایٹی فائیو پرسنٹ سے زیادہ نمبر لانے تھے ہر صورت۔

سالانہ ایگزامز کے بعد فارغ بیٹھنے کے بجائے اس نے مطالعے کو وقت دینا شروع کردیا۔

ایف ایس سی کا رزلٹ آؤٹ ہوا' اس کے تمام تر بے نام خدشات کے باوجود اس کے نمبر ایٹی ایٹ پرسنٹ سے زیادہ تھے۔

درشہوار نے اس دن گھر میں ہادیہ کی پسند کی ڈشز بنائیں۔ لیکن کھل کر پھر بھی تعریف نہیں کی' جس کی حسرت میں وہ مری جارہی تھی۔

ہادیہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کررہی تھی۔

وہ پریشان بھی تھی کہ امی اسے میڈیکل کی مہنگی تعلیم کیسے دلوا پائیں گی۔

٭ ٭ ٭

درشہوار نے سیونگ سرٹیفکیٹ آڑے وقتوں کے لیے خریدے تھے۔ بچوں کی جا بے جا ہر ضد پوری نہیں کی۔ ان کے کپڑے بھی گھر کے باقی بچوں کے مقابلے میں نارمل ہوتے' خود ہادیہ اور عبدالرحمٰن نے بھی اس سے زیادہ ضدیں نہیں کی تھیں۔

عبدالرحمٰن' ہادیہ سے بڑا تھا۔ وہ اس وقت فائنانس میں ایم بی اے کررہا تھا اور فائنل ایئر میں تھا۔

ہادیہ انٹری ٹیسٹ میں کامیاب ہوگئی تھی۔ یہاں پہ اس کی محنت اور دعائیں رنگ لائیں۔ اس کا داخلہ میرٹ پہ آرمی میڈیکل کالج میں ہوگیا۔ اس موقع پہ درشہوار نے سیونگ سرٹیفکیٹ بھنائے اور ہادیہ کی فیس جمع کروائی۔

اب منزل قریب تھی' کیونکہ عبدالرحمٰن بھی فائنل ایئر میں تھا۔

٭ ٭ ٭

جب ہادیہ سیکنڈ پراف میں آئی تو عبدالرحمٰن کو ایک بینک میں جاب مل گئی۔ درشہوار کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا' کیونکہ اب عبدالرحمٰن کی تعلیم کا خرچا نہ تھا۔ کچھ اور وقت گزرا۔ ہادیہ میڈیکل کے فورتھ پراف میں آچکی تھی۔

اسی دوران عبدالرحمٰن کو ایک سوئس بینک میں جاب آفر ہوئی۔ سیلری پیکیج اور دیگر مراعات بہت پرکشش تھیں۔ سو اس نے پہلی والی جاب چھوڑ دی۔ اب وہ اپنا گھر بنانا چاہتا تھا۔

نانا' نانی بوڑھے ہوچکے تھے۔ ان نامساعد حالات میں ان کا دم غنیمت تھا۔ ان کے دم سے درشہوار نے یہ کڑا سفر جیسے تیسے طے کیا تھا اور سعی کررہی تھی۔

٭ ٭ ٭

رات وہ عشاء کی نماز کے بعد مصلے پہ ہی بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ جب ہادیہ اندر آئی' وہ کچھ پریشان سی تھی۔

"امی! دعا کیجیے گا' کل میرا رزلٹ ہے۔" وہ اس سے نظریں ملا کر بات نہیں کررہی تھی۔ اس کی طرف مسلسل خاموشی طاری رہی تو وہ باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد درشہوار بستر پہ لیٹ گئی۔ وہ دور اپنے ماضی میں بھٹک رہی تھی۔

٭ ٭ ٭
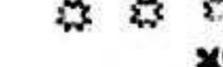
درشہوار نے ایک متوسط طبقے کے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ پانچ بہن بھائی تھے۔ وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس حساب سے جو توجہ اور محبت اسے ملنی چاہیے تھی نہیں ملی۔

شروع سے ہی اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ چھٹی کلاس میں تھی جب بڑے بھائی کی شادی ہوئی۔ اس سے اگلے دو سالوں میں دو اور بھائیوں کی شادی ہوگئی۔ وہ آہستہ آہستہ تعلیمی مدارج طے کرتی گئی۔

وہ میٹرک میں تھی جب شیراز احمد کا رشتہ اس کے لیے آیا۔ فوراً" منگنی بھی ہوگئی۔ وہ روتی پیٹتی رہ گئی کہ مجھے ڈھیر سارا پڑھنا ہے' لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔

میٹرک کے فوراً" بعد وہ وداع ہوکر شیراز کے گھر آگئی۔ خوش قسمتی سے اسے سسرال اچھی ملی۔ سسر تو تھے نہیں ایک ساس اور دو شیراز کے بڑے بھائی تھے۔

شیراز خود تعلیمی طور پر مضبوط بیک گراؤنڈ رکھتا تھا اور اسے درشہوار کا یہ شوق اور جذبہ بھلا لگا تھا' چنانچہ اس نے خود جاکر بیوی کا ایڈمیشن کرایا۔

جب اس نے سیکنڈ ایئر کلیئر کیا' اس وقت تک عبدالرحمٰن اس کی گود میں آچکا تھا۔

ماس کمیونیکیشن کے پارٹ ٹو میں تھی جب ہادیہ نے آکر ان کے خاندان کو مکمل کردیا۔

وہ اپنی زندگی میں مگن تھی جب موت کے ہاتھوں نے شیراز کو ان سے جدا کردیا۔ ان دونوں نے ہادیہ اور عبدالرحمٰن کے لیے کتنے خواب دیکھ رکھے تھے۔ خاص طور پہ ہادیہ کے معاملے میں درشہوار بہت پرجوش تھی۔

شیراز کی موت کے بعد وراثت کے جھگڑے شروع ہوگئے۔ اس کی ساس ہادیہ کی پیدائش سے پہلے فوت ہوگئی تھیں' ورنہ ہوسکتا ہے یہ جھگڑے اتنی شدت اختیار نہ کرتے۔

ان ہی جھگڑوں کے درمیان اس نے ماس کمیونیکیشن میں گریجویشن مکمل کیا۔ پھر کہیں بھی راہ فرار نہ پاکر امی ابو کے پاس چلی آئی۔

شروع شروع کا وقت تھا سو سب نے ہی خوش

آمدید کہا۔ آہستہ آہستہ تلخ حقیقتیں آشکار ہونے لگیں تو وہ گھبرا گئی۔ اب وہ بڑی شدت سے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔

سو ایک دن بڑے بھائی کے پاس پہنچ گئی۔ "بھائی! مجھے یونیورسٹی سے داخلہ فارم لا دیں۔" وہ اخبار پڑھ رہے تھے چونک سے گئے۔

"داخلہ فارم کا کیا کرنا ہے؟" وہ حیران سے ہوئے۔

"بھائی! مجھے ایم ایس سی کرنا ہے' اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ فارم لا دیں۔" اس نے وضاحت کی۔ بھائی نے کوئی جواب نہیں دیا' مگر شام تک اسے فیصلہ سنا دیا گیا کہ اسے مزید کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا پڑھ کر اس نے نوکری کرنی ہے' بھائیوں کے سر جھکانے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔

وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ شادی' بچے اور شیراز کی موت کے بعد بھی وہ دل سے تعلیم کی لگن دور نہیں کر پائی تھی۔ اس نے سارے خواب ہادیہ میں مجسم کر لیے۔ وہی خواب جو آج دوسری بار ٹوٹے تھے۔

ہادیہ بھی بہت ذہین تھی۔ لیکن درشہوار نے کبھی کھل کر تعریف اور حوصلہ افزائی نہیں کی' اس میں آگے بڑھنے کی لگن پیدا کرنے کے لیے وہ یہی کہتی کہ اور اچھا کر سکتی تھیں اور اچھے نمبر لے سکتی تھیں۔

ہادیہ اس کے خوابوں کی تعبیر کے لیے سر توڑ محنت کر رہی تھی۔ اب کل رزلٹ آؤٹ ہو رہا تھا۔ شکر تھا کہ اس کے اس رویے سے ہادیہ کبھی بددل نہیں ہوئی' بلکہ وہ اور بھی محنت شروع کر دیتی۔

اس کے خواب کی تعبیر میں کم ہی وقت رہ گیا تھا۔ آج کیا کیا کچھ یاد آ رہا تھا۔

وہ ماضی کے دھندلکوں میں جانے اور کتنی دیر کھوئی رہتی کہ ہڑبڑا کر حال کی دنیا میں واپس آ گئی۔ قریبی مسجد سے اذان ہو رہی تھی۔

اس نے نماز کے بعد بڑے جذب سے دعا مانگی۔

☆ ☆ ☆

آج ہادیہ کی بے تابی دیدنی تھی۔ جبکہ درشہوار بہت پُرسکون تھی۔

انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں۔

ہادیہ اخبار لیے بھاگتی ہوئی درشہوار کے پاس آئی جو بظاہر بے نیازی سے کچن میں مصروف تھی۔

"امی! امی! دیکھیے تو میرے مارکس' میں ڈاکٹر بن گئی ہوں۔" ہادیہ کا چہرہ مارے خوشی کے سرخ ہو رہا تھا۔

"امی! جب مجھے ڈگری ملے گی نا تو میں کہوں گی کہ میرے بجائے یہ ڈگری میری امی کو دیں' کیونکہ یہ حق میرا نہیں امی کا ہے۔"

درشہوار نے ہادیہ کو ساتھ چمٹا لیا' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

اس کی سسکیاں رکنے میں نہیں آ رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ہادیہ بھی رو رہی تھی۔ "میری بچی! تم نے میرے سارے خوابوں کو آج بکھرنے سے بچا لیا ہے۔" وہ روتے روتے یہی بات بولے جا رہی تھی۔

"امی! آپ نہ ہوتیں تو میں کبھی بھی ڈاکٹر نہ بن سکتی' تب ہی تو کہتی ہوں یہ ڈگری میری نہیں آپ کی ہے۔"

"ہادیہ ہر لمحہ مجھے اپنے خوابوں کے ٹوٹنے کا دھڑکا ہی لگا رہا' اسی خوف کی وجہ سے میں نے تمہیں سراہا ہی نہیں۔" وہ آج سچ بول رہی تھی۔

"امی! آپ یوں نہ کہیں در پردہ آپ میری حوصلہ افزائی ہی کرتی رہیں' آگے بڑھنے پہ اکساتی رہیں' یاد ہے پری بورڈ کے ایگزام میں میری سیکنڈ پوزیشن آئی تو آپ نے کہا کہ میں فرسٹ پوزیشن بھی لے سکتی ہوں۔ امی آپ کے اسی جملے نے مجھے محنت کرنے پر اکسایا اور آج آپ کے سامنے ہوں۔"

درشہوار نے بڑی محبت سے اس کی پیشانی پہ پیار کیا۔

اس کے خواب آج ٹوٹے اور بکھرے نہیں تھے۔ ہادیہ کی صورت میں انہوں نے تعبیر پا لی تھی۔

☆

نبیلہ ابر راجہ

خوشی سے اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

گوٹے والا سرخ سوٹ و سنہری کھسہ اور چوڑیوں کا پورا سیٹ امی اس کے لیے لائی تھیں۔ ابھی عید میں پورے سولہ دن باقی تھے اور امی آج بازار جاکر عید کے کپڑے لے آئی تھیں۔ امی چاروں بھائیوں کے کپڑے، جوتے بھی لائی تھیں۔ مگر عریشہ کو ان کے کپڑوں، جوتوں سے زیادہ اپنی چیزیں دیکھ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔ گوٹے والا عام سا ریڈی میڈ سوٹ اور اس کے ساتھ کا سنہری تاروں والا کھسہ اسے بہت قیمتی لگ رہا تھا۔

"ادھر دو، میں صندوق میں رکھ دوں، خراب ہو جائے گا۔" امی نے کپڑوں والا شاپر اس سے زبردستی لیا تو وہ منہ بسورنے لگی، مگر امی نے پروا نہیں کی۔

"افطاری کے لیے بیسن گھولا کہ نہیں؟"

انہیں اب خیال آیا تھا۔ عریشہ خوف زدہ سی ہو گئی، کیونکہ اب لازمی اس کی شامت آنے والی تھی، کیونکہ امی روزے کی حالت میں بازار کی خاک چھان کر آئی تھیں، اور اب ان سے افطاری بننے والی نہیں تھی۔ کیونکہ ان کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی۔ کام ان سے ہوتا نہیں تھا اور ابو محدود آمدنی رکھنے والے عام سے ادارے میں معمولی سے ملازم تھے۔ وہ ملازمہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ امی کی طبیعت آئے دن خراب رہتی تھی۔ ان کی دعا دارو پر بھی اچھا خاصا خرچا اٹھ جاتا تھا۔ امی کو تو کسی خطرناک بیماری کا وہم تھا، کیونکہ عریشہ کو ایسے ہی لگتا تھا کہ امی خوامخواہ کا وہم کرتی ہیں اور کڑھتی ہیں۔ مہینے کے بیشتر دن وہ بستر پر ہی نظر آتی تھیں۔ جب سے ان کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی تھی، تب سے عریشہ کی شامت آگئی تھی۔

گھر کے سب کام اسے کرنے پڑتے تھے۔ وہ مشکل سے دس سال کی تھی۔ اسکول سے آتے ساتھ ہی جس منظر سے واسطہ پڑتا، وہ کچھ یوں ہوتا۔ امی بستر پہ لیٹی ہوئی، بستر، چادریں، تکیے اسی طرح بکھرے ہوتے جس طرح وہ صبح چھوڑ کر جاتی، گندے برتنوں پہ مکھیاں ضیافت اڑا رہی ہوتیں۔ اور کھانے کو کچھ نہ ہوتا۔

اسکول سے واپسی پہ اسے شدت کی بھوک لگی ہوتی، کیونکہ امی کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے صبح ناشتا بھی برائے نام ملتا، ایک کپ چائے ساتھ دو پاپے۔ بڑھتی عمر تھی، کھیل کود میں سب ہضم ہو جاتا۔ ابا کی اتنی آمدنی نہیں تھی جو اسکول جیب خرچ کے نام پہ اسے زیادہ پیسے دیتے۔ سو اسے دل مارنا پڑتا، لیکن بچی تھی۔ ساتھی لڑکیوں کو کھاتے دیکھ کر اس کا دل بھی مچل جاتا، وہ روز بریک ٹائم میں پکوڑے، سموسے، چاٹ اور ٹھنڈی بوتل پیتی تھیں، جبکہ عریشہ کے پاس صرف پانچ روپے ہوتے۔ ان پیسوں میں وہ اپنی پسند کی کوئی چیز بھی نہیں لے سکتی تھی۔ گھر آتی تو کھانے کو نہ ملتا۔ مجبوراً ننھے ننھے ہاتھوں سے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ بنانا پڑتا۔ اس کام میں اس سے دو سال بڑا فواد مدد کرتا، وہ اس کے مقابلے میں ہوشیار تھا۔ عریشہ آلو کاٹ دیتی، وہ توے پہ گھی ڈال کر بھون لیتا۔ پھر عریشہ جیسے تیسے ٹیڑھی میڑھی کچی پکی روٹیاں پکاتی تو امی کے ساتھ ساتھ باقی بہن بھائی بھی کھاتے۔ فواد چاول بھی بنا لیتا تھا۔ وہ روٹی سالن کے مقابلے میں ذرا آسانی سے بن جاتے تھے، عریشہ نے فواد کو دیکھ دیکھ کر سیکھ لیا تھا۔ کچے پکے، ادھ گلے چاول اس بھوک کے عالم میں انہیں من و سلویٰ سے کم نہیں لگتے تھے۔

☆ ☆ ☆
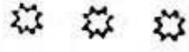
رات سے امی کو بہت سردی لگ رہی تھی۔ عریشہ نے دوسری رضائی ان کے مانگنے پہ ان کے اوپر ڈالی تھی۔ تب تک ان کا سب سے بڑا بھائی نعیم بھی ورکشاپ سے آگیا تھا۔ نعیم بالکل ان پڑھ تھا۔ وہ عام سے گاؤں کے رہائشی تھے، جہاں کوئی سرکاری، غیر سرکاری اسکول نہیں تھا۔ نو سال کی عمر سے نعیم کو ایک آٹو مکینک کی ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ وہ صبح و سویرے جاتا تو رات نو بجے سے پہلے واپس نہ آپاتا۔ امی سے وہ سب سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ آتے ساتھ ہی ان کی طبیعت کا پوچھتا، پھر کھانے کو بیٹھتا۔ وہ بہت حساس اور باشعور تھا۔ اسے کام کرتے

ہوئے چھ' سات سال ہوگئے تھے۔ ان سالوں میں ان کے گاؤں میں ایک سرکاری اسکول کا اضافہ ہوچکا تھا۔ چنانچہ نعیم سے چھوٹے بہن بھائی سب وہاں زیر تعلیم تھے۔ ان میں عریشہ لائق تھی' اسے پڑھنے کا شوق بھی تھا' سو اچھے نمبر لاتی تھی۔ اس سال اس نے پانچویں کلاس کے بورڈ کا امتحان دینا تھا۔ ٹیوشن کا ان کے ہاں کوئی خاص رواج نہیں تھا۔ اسے خود پڑھنا اور سمجھنا ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اس کا شمار کلاس کی ہونہار بچیوں میں ہوتا۔

مگر اب اس کی توجہ پڑھائی پر سے کم ہوتی جارہی تھی۔ کیونکہ امی بیمار جو رہنے لگی تھیں۔ اسکول سے آکر اسے اکثر اوقات کھانا پکانا پڑتا۔ فواد کے ساتھ مل کر۔ عریشہ سے چھوٹا ایک اور بھائی بھی تھا' وہ بھی چھوٹے چھوٹے کاموں میں ان کی مدد کرتا' پھر عریشہ فواد اور چھوٹے بھائی کے ساتھ کنویں سے پانی بھر کے لاتی۔ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرتی۔

ابو قریبی شہر میں معمولی سی نوکری کررہے تھے۔ روزانہ سائیکل پہ آتے جاتے' کیونکہ بسوں' ویگنوں کا کرایہ دینا ان کے بس سے باہر تھا۔ اس مد میں بچنے والے پیسے سے کئی اور چیزیں خریدلی جاتیں' جس میں عریشہ کے جہیز کی چیزیں سرفہرست تھیں۔ بیٹی کی ذات تھی' بڑھتے ہوئے کون سا دیر لگتی تھی۔ قد اس عمر میں بھی اس کا اچھا خاصا نکل آیا تھا۔ عریشہ کی امی اس معاملے میں روایتی ماؤں کی طرح ابھی سے فکرمند تھیں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں خرید رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بچتیں کرکے انہوں نے بیٹی کے لیے اسٹیل کے برتن لیے تھے۔ لاکھ ان کی طبیعت خراب رہتی تھی' مگر کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس جانے سے کتراتیں کہ پیسے خرچ ہوجائیں گے۔ گاؤں کی واحد سرکاری ڈسپنسری سے علاج معالجہ کرانے کو وہ ترجیح دیتیں اور ڈسپنسری کا علاج برائے نام ہی تھا۔ لیکن گزارہ چل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نعیم پریشان سا تھا' امی سر' منہ لپیٹ کے پڑی تھیں۔ ابو بھی دفتر سے شام کو آنے لگے تھے۔ عریشہ' فواد اور دوسرے بھائی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے مل جل کر گھر کی صفائی کی' کنویں سے پانی بھرا اور پھر فواد نے ہی عریشہ کے ساتھ مل کر آلو بنائے۔ اتنے میں نعیم بھی آگیا۔ گاؤں میں کوئی ہوٹل وغیرہ تو تھا نہیں' جو وہ روٹیاں ہوٹل سے لاتے۔ چنانچہ پڑوسن نے آکے روٹیاں ڈال دی تھیں۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھیں کہ عریشہ کی امی آئے روز بیمار رہنے لگی ہیں اور گھر کے کام کاج پہلے کی طرح سرانجام نہیں دے سکتیں' اس لیے جب وہ روٹیاں پکارہی تھیں تو ساتھ عریشہ کو بھی بٹھالیا کہ وہ بھی دیکھے کیونکہ روز' روز آکر وہ کام نہیں کرسکتی تھیں۔ پرسوں اس نے ان کے سارے گھر کے کپڑے دھوئے تھے۔ کنویں سے پانی بھر کے لانا اور کپڑے دھونا آسان نہیں تھا' کیونکہ وہ خود بھرے پرے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اپنے گھر کے کام کاج ہی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ وہ کہاں ان کے کام کرتیں' روز' روز' سو انہوں نے عریشہ کو کچھ سکھانے کی کوشش کی۔

عریشہ اور فواد میں بھائیوں جتنی محبت بہت زیادہ تھی۔ کم عمری کے باوجود گزارا ہو ہی رہا تھا۔ ان کے گھر میں بک بک نہیں ہوتی تھی۔ آپس میں ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس بھی تھا۔ سو تنگی ترشی والا وقت بھی گزر ہی رہا تھا۔

عریشہ نے امی کے سونے کے بعد بستہ کھولا۔ ہوم ورک بہت زیادہ تھا اور انگلش کے ساتھ ریاضی کا بھی ٹیسٹ تھا۔ ابو لیٹے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ان کے گھر میں دو ہی تو کمرے تھے۔ ایک بڑا اور ایک چھوٹا تھا۔ عریشہ چھوٹے کمرے میں ہوم ورک کررہی تھی۔ ہوم ورک کرتے کرتے ہی اسے نیند آنے لگی۔ صبح کی جاگی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد کام میں لگ گئی تھی۔ اب کمزور جسم آرام مانگ رہا تھا۔ فواد اور دوسرا بھائی ٹی وی دیکھتے دیکھتے سوگئے تھے۔ صرف نعیم تھا جو جاگ رہا تھا۔ اسے بھی جمائیاں آرہی تھیں۔

عریشہ نے مشکل سے اردو کا ہوم ورک مکمل کیا تھا۔ صبح سحری کے وقت امی آواز دے کر اٹھادیتی

تھیں۔ جیسے تیسے سحری کے ٹائم امی پرسوں اٹھی تھیں' نعیم نے آگ جلا دی تھی۔ امی نے چائے کا پانی چڑھایا۔ اتنے میں فواد بھی نعیم کے جگانے پہ اٹھ گیا۔ عریشہ بھی آگئی۔ انہوں نے سحری کے لیے تمام چیزیں اکٹھی کرکے امی کے پاس رکھیں۔ سحری میں رات کا بچا سالن اور چائے کے ساتھ موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ وہ بھی امی نے بڑی مشکل سے پکائیں۔ ان سب نے سحری کھائی۔ امی ان سب سے پہلے اٹھ کر لیٹ گئی تھیں۔ انہوں نے چائے کے ساتھ تھوڑی سی روٹی کھائی تھی۔

نعیم نے زبردستی انہیں دوائی کی ایک خوراک کھلائی اور روزہ رکھنے سے منع کیا۔ لیکن طبیعت کی خرابی کے باوجود وہ باز نہ آئیں اور اب عریشہ پہ گرج برس رہی تھیں۔ تو دس سال کی معصوم سی بچی ہی کھیل کود میں بھول بھال گئی تھی کہ افطاری کے لیے کچھ کرنا بھی ہے۔ امی کو بہت غصہ آیا تھا۔ انہوں نے اسے کس کس کے دو تھپڑ لگائے اور خود لیٹ کے رونے لگیں۔

عریشہ اپنا رونا بھول گئی۔ کیونکہ اسے پتا تھا' امی اب نہیں اٹھیں گی اور اب باقی سارا کام اسے ہی کرنا ہوگا۔ آج تو فواد بھی کھیل رہا تھا۔ اسے گھر واپسی کا ہوش ہی نہیں تھا۔ عریشہ کرتی تو کیا کرتی۔ خیر اتنے میں ابو بھی لوٹ آئے' وہ سموسے اور فروٹ لائے تھے۔ عریشہ نے دھو کر رکھ دیا۔ ابو نے پکوڑے بنانے سے منع کردیا۔ انہوں نے عریشہ کی سوجی آنکھیں دیکھ لی تھیں۔ بچے بے چارے مرجھاتے جارہے تھے۔ تب ہی تھوڑی دیر بعد ساتھ والوں نے افطاری بھجوادی تھی۔ کافی ساری چیزیں تھیں سو ان کی افطاری بہت اچھی ہوگئی۔ بچا ہوا سالن امی نے سحری کے لیے رکھوادیا۔

☼ ☼ ☼
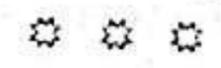
رمضان تیزی سے اختتام کی طرف گامزن تھا۔ امی کی طبیعت کبھی خراب' کبھی ٹھیک ہوتی۔ عریشہ کو وہ دن یاد آتے جب امی بالکل صحت مند تھیں' تب وہ سارے گھر کا کام کرتیں' کھانا بناتیں' لیکن چھوٹے موٹے کام وہ عریشہ سے بھی لیتیں۔ وہ روایتی ماؤں کی طرح سختی کرتیں اور گھرداری کے رموز سمجھاتیں۔ عریشہ ان سے بہت ڈرتی تھی' کیونکہ وہ ہاتھ اٹھانے سے بھی چوکتی نہیں تھیں۔

☼ ☼ ☼

اور پھر عید کا دن آگیا۔ عریشہ نے صبح ہی اٹھ کر کپڑے پہن لیے تھے۔ دوسرے گاؤں سے اس کی دونوں پھوپھیاں آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے عیدی دی تو وہ اچھلتی کودتی باہر جانے لگی۔ امی نے آواز دے کر بلالیا۔

"گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں' میں اکیلی جان کیا کیا کروں' تم ذرا یہ برتن دھولو۔" انہوں نے اسے بٹھا دیا۔

عریشہ کو بہت غصہ آیا۔

"امی! میں دکان پہ جاؤں گی' غبارے لوں گی' گڑیا لوں گی۔ میری سہیلیاں بھی ہیں۔" پھوپھو کے دیے پیسے ابھی بھی اس کی مٹھی میں دبے تھے۔

"یہ کام کون کرے گا۔ ابھی بیٹھو بعد میں چلی جانا۔" امی نے ڈپٹا تو عریشہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس کا سارا دن امی کے ساتھ کام کرواتے ہوئے گزر گیا۔

امی گوشت بھون رہی تھیں۔ بھونتے بھونتے کسی کام سے اندر گئیں۔

"عریشہ! ذرا ہانڈی کا خیال رکھنا۔" انہوں نے اندر سے ہی آواز دی۔

"اچھا امی!" وہ سعادت مندی سے بولی۔ لیکن ٹھیک طرح سے ہانڈی میں چمچہ چلایا ہی نہیں جارہا تھا۔ نتیجتاً ہانڈی نیچے سے لگنا شروع ہوگئی۔ عریشہ اپنے طور پہ کوشش کرتی رہی' پر گوشت جل گیا۔

امی نے آکر دیکھا تو غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بالوں سے پکڑ کر بڑے زور کا طمانچہ مارا۔ وہ تو بچت ہوگئی کہ پھوپھو آئی ہوئی تھیں'

ورنہ اس کی خوب شامت آتی' یوں عریشہ کی عید روتے ہوئے گزری۔

رات پھوپھو نے اسے اپنے پاس سلایا۔ تب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

☼ ☼ ☼
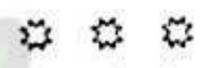
پانچ سال وقت آگے سرک آیا تھا۔

عریشہ اب دسویں کلاس میں تھی۔ اس نے خوب رنگ روپ اور قد کاٹھ نکالا تھا۔ ان پانچ سالوں میں وہ گھرداری اور کھانے پکانے کے فن میں طاق ہو چکی تھی۔ گھر کی تمام ذمہ داری اب اس کے سر تھی۔ صفائی سے لے کر کھانا پکانا' کپڑے دھونا' بھائیوں کی فرمائشیں پوری کرنا سب وہی کرتی تھی۔

امی کی بیماری کا وہی حال تھا۔ کبھی بیمار' کبھی ٹھیک۔ وہ جسمانی کمزوری اور پٹھوں کے درد کا شکار تھیں۔

عریشہ ان ہی حالات میں وقت سے پہلے باشعور ہوئی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب ذمہ داریوں کی اس بھیڑ میں بچپن رخصت ہوا' جوانی دستک دینے لگی۔

☼ ☼ ☼
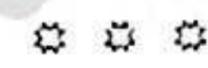
بڑی پھوپھو' چھوٹی خالہ' تایا ابو اور رشتے کے ایک ماموں سب ہی عریشہ کا رشتہ مانگ رہے تھے۔ عریشہ کی امی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کس کو ہاں کریں' کس کو نا کریں۔ کسی ایک کو ہاں کرتیں تو دوسرا ناراض ہو جاتا کہ سب رشتہ دار ہی قریبی تھے۔

عریشہ کے ابو بھی پریشان تھے۔ اپنی پریشانی کا ذکر انہوں نے سب سے قریبی دوست رحمان احمد سے کردیا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے بیٹے کے لیے کہا۔ کیونکہ وہ عریشہ کو دیکھ چکے تھے۔ اپنے آپ میں مگن' کاموں میں مصروف خاموش سی عریشہ انہیں پسند آئی تھی۔

انہوں نے تو دلیری ہی پکڑ لی۔ عریشہ کے ابو کو ہاں کرتے ہی بنی۔ عریشہ آگے تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی' لیکن وسائل اجازت نہیں دے رہے تھے۔ پھر امی کو بھی فکر کھائے جارہی تھی کہ عریشہ کے کب ہاتھ پیلے ہوں اور وہ نعیم کی دلہن بیاہ کر لائیں۔ خود تو وہ اب گھر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی تھیں۔ شوگر اور گھٹنوں میں درد کے ساتھ ساتھ انہیں اور بھی بیماریاں لاحق ہو چکی تھیں۔

یوں عریشہ کے سلسلے میں رحمان احمد کو ہاں کر دی گئی۔

رحمان احمد قریبی شہر میں رہائش پذیر تھے اور ان کے بیٹے نے جس کی نسبت عریشہ کے ساتھ ٹھہری تھی۔ بی اے کر رکھا تھا اور نیم گورنمنٹ ادارے میں ملازم تھا۔ معقول لڑکا تھا' مہذب اور خوش اخلاق عریشہ کے ابو کو پسند تھا۔ انہوں نے اپنوں کی ناراضی مول لے کر یہ رشتہ طے کیا تھا۔

سردیوں کی ایک اداس سی شام عریشہ رخصت ہو کر شیراز احمد کے گھر آگئی۔ بوڑھی بیمار ساس کے علاوہ دو چھوٹی نندیں اور ایک دیور افراد خانہ میں شامل تھے۔ دو بڑی نندیں شادی شدہ تھیں۔ اور شیراز سے بڑا ایک بھائی بھی شادی شدہ بال بچوں والا تھا۔

گھر میں کل چار کمرے تھے۔ ایک کمرہ ساس سسر کے استعمال میں تھا' ایک میں شیراز کا بڑا بھائی بیوی بچوں سمیت رہائش پذیر تھا۔ ایک میں دو غیر شادی شدہ نندیں' ایک دیور تھا اور بچ رہ جانے والے ایک کمرے میں عریشہ کا سامان سیٹ کیا گیا تھا۔ دن کو یہ کمرہ ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا اور رات میں بیڈ روم کا کام لیا جاتا۔

یہاں ذمہ داریوں کا بوجھ میکے سے بھی زیادہ تھا۔ بوڑھی بیمار ساس کے کسی کام میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ گرجنے برسنے لگتیں۔ نندیں دونوں اسکول جاتی تھیں اور چھوٹی تھیں' دیور کالج میں تھا۔ عریشہ صبح سویرے اٹھتی تھی۔ شہزاد کو ناشتا دینے کے بعد پھر سب گھر والوں کا ناشتا تیار کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ دوپہر کا کھانا شہزاد کی بھابھی تیار کرتیں۔ برتن عریشہ دھوتی۔ پھر باقی ذمہ داریاں بھی دونوں نے بانٹی ہوئی

تھیں۔ عریشہ کم عمر اور دبے دبائے ماحول سے آئی تھی۔ اس بات کو شیراز احمد کی بھابھی نے بہت جلد محسوس کرلیا تھا۔ سو وہ اپنے کام بھی اس کے سپرد کر کے چلتی بنتیں۔ عریشہ احتجاج تک نہ کرسکتی۔ ان ہی حالات میں عریشہ اوپر تلے پانچ بچوں کی ماں بنی۔ سب سے پہلے رابعہ دنیا میں آئی اس کے بعد چار بھائی۔

عریشہ وقت سے پہلے ہی بوڑھی لگنے لگی تھی۔

اس نے بہت سی خواہشات مار کر اس گھر کو گھر بنایا تھا۔ ساس' سسر فوت ہوگئے تھے۔ شیراز کے بھائی' بھابھی اپنا حصہ لے کر الگ ہوگئے تھے۔ دونوں چھوٹی نندوں کی شادی ہوگئی تھی اور دیور ملازمت کے بعد دوسرے شہر جا بسا تھا۔ اب بس عریشہ اور اس کے بچے ہی تھے۔

گزرے وقت نے عریشہ کے اعصاب کو بہت کمزور کردیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح اب محنت نہیں کرسکتی تھی۔

رابعہ دس سال کی تھی اور اسے پڑھائی کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ اپنے کھلونے اور گڑیاں لے کر بیٹھ جاتی۔ اسے گڑیا کی شادی کرنے کا بہت شوق تھا۔ عریشہ کے سر میں اکثر و بیشتر درد ہوتا وہ سرہانے بیٹھ جاتی' ایک بار اس نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے الٹی سیدھی چائے بنا کر اسے دی۔ وہ بھی اب سمجھ دار ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا آغاز تھا' پر رابعہ نے شور مچایا ہوا تھا کہ مجھے عید کے کپڑے اور جوتے لے دیں۔ بہت ضدی اور لاڈلی تھی وہ۔ آفس سے آنے کے بعد شیراز اسے خود مارکیٹ لے گیا اور رابعہ کو اس کی پسند کے کپڑے' جوتے اور دیگر چیزیں دلائیں' وہ بہت خوش تھی۔

رویت ہلال کمیٹی نے چاند نظر آنے کا اعلان کردیا تھا۔

کل کا دن عریشہ کے لیے مصروفیات کا طوفان لے کر آنے والا تھا۔ اس کی چاروں نندیں' دیور شیراز کا بھائی' بھابھی سب نے ان کے ہاں آنا تھا۔ کیونکہ عید کے پہلے دن شیراز سب بہن' بھائیوں کی اپنے گھر دعوت کرتا تھا۔

عریشہ کو تو خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ کب عید کا دن شروع ہوا' کب شام ہوئی اور کب رات ہوئی۔ رات کو وہ تھک کر چور ہوتی تھی۔ عید کی کوئی خوشی' امنگ اس کے محسوسات کا حصہ نہیں بنی تھی۔ زندگی مشینی روبوٹ کی طرح گزر رہی تھی۔ سنہرے موسم کیسے گزرے خبر ہی نہیں ہوئی۔ اب بڑھاپا دستک دے رہا تھا۔ وہ جھکنے لگی تھی۔ عمر کے خوب صورت برسوں کی فکروں نے چاٹ لیا تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے بیس سال بڑی نظر آنے لگی تھی۔ اس کے ہم عمر بھی آنٹی کہہ کر پکارتے تھے۔ ماتھے اور آنکھوں تلے پڑی لکیریں' لٹکتی ٹھوڑی اور آدھے سے بھی زیادہ سر کے سفید ہوتے بال اسے بڑے آرام سے جوانی کی فہرست سے خارج کرگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج عریشہ کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ فروٹ چاٹ' پھولوں' بریانی کے ساتھ چکن کڑاہی اور سویٹ ڈش بھی بنانی تھی۔ کچھ خاص الخاص ڈشز اس کے علاوہ بھی تھیں۔

چھوٹے تو اس نے چاند رات کو ہی بنا لیے۔ کسٹرڈ بھی بنا کر فریج میں رکھ دیا۔ رابعہ نے ماں کے چہرے پہ پژمردگی اور تھکاوٹ کے آثار دیکھے تو خود بھی اس کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کروانے لگی۔ اس کے چھوٹے موٹے کاموں میں بھی سلیقہ اور نفاست تھی۔ بالکل عرشہ کی طرح۔

"امی! مجھے کوئی اور کام بھی بتا دیں' باقی ہے تو۔" وہ کچن کا شیلف صاف کرتی عرشہ سے پوچھ رہی تھی۔ کام بہت سے باقی تھے۔ عرشہ نے اسے بتایا۔ وہ سعادت مندی سے عمل کرنے لگی۔

عید کا دن مخصوص گہما گہمی لیے طلوع ہوا۔ شیراز عید کی نماز پڑھ کر آچکے تھے۔

رابعہ فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ہاتھوں میں مہندی سجائے چوڑیاں پہنے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ عید مبارک کہتے ہوئے عرشہ کے گلے لگ گئی۔ بچپن کی آخری سرحد پہ کھڑی چمکتی آنکھوں' معصوم چہرے کے ساتھ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

عرشہ کی نندیں' دیور' شیراز کے بھائی بھابھی سب آچکے تھے۔ وہ پرانے ملگجے کپڑوں میں ابھی تک مصروف تھی۔ رات سے اسے ہلکا ہلکا بخار تھا اور سر میں درد تھا۔ لیکن اس کے پاس آرام کرنے کا وقت نہیں تھا۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کے ساتھ پھیلاوا بھی سمیٹنا تھا۔

رابعہ ماں کے پاس کچن میں آگئی۔ عرشہ نڈھال سی کچن میں پڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"امی! کیا ہوا ہے؟ سر میں درد ہے؟" وہ امی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے انداز میں محبت اور فکر مندی تھی۔ عرشہ کے دل میں پہلی بار خوشی کی لہر اٹھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کا سر دبانے لگی۔

"امی! آپ جائیں ادھر پھوپھو لوگوں کے پاس۔ مجھے بتا دیں' کام میں کرا دوں گی۔" وہ بہت بڑی بڑی لگنے لگی تھی اچانک ہی۔ عرشہ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امنڈ آئے۔ جسے اس نے بڑی مشکل سے پلکوں کی باڑھ پھلانگنے سے روکا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے رابعہ کی طرف دیکھا۔

سجی بنی' خوشیوں کی جوت سے چمکتا چہرہ' اس کے دونوں ہاتھوں میں مہندی سجی ہوئی تھی۔ برسوں پہلے کی ایک عید اس کے تصور میں زندہ ہو گئی۔ جب اس نے بھی شوق سے مہندی رچائی تھی' اسے مہندی کا رنگ ہلکا ہونے کا خوف تھا۔ لیکن امی نے سب کام اس سے کروائے تھے۔

"رابعہ بیٹا! میں ٹھیک ہوں۔" اس نے رابعہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ ان ہاتھوں پہ رچی مہندی کے رنگ وہ ماند نہیں کر سکتی تھی۔

رابعہ کی گڑیا کو وہ اپنے ہاتھوں پھانسی نہیں دے سکتی تھی۔ یہ ہی تو عمر تھی جگنو پکڑنے کی اور گڑیا سے کھیلنے کی۔ "تم جاؤ اندر پھوپھو کے پاس اور یہ سویاں دے آؤ' پھر اپنی سہیلیوں کے پاس چلی جانا۔" اس نے زبردستی رابعہ کو وہاں سے نکالا۔

برسوں بعد اسے سکون کا احساس ہوا تھا۔

کچن سمیٹ کر اس نے نئے کپڑے پہنے تو شیراز کے چہرے پر بھی خوشی چمکنے لگی' رابعہ نے اس کی بے ساختہ تعریف کر دی۔

"امی! آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" عرشہ کی ساری تھکن پل بھر میں ہوا ہو گئی۔

اس نے ساڑھے دس سالہ رابعہ کو لپٹا لیا۔ عید کے سب رنگ اس چھوٹے سے گھر میں اتر آئے تھے۔ عید واقعی برسوں بعد عید لگ رہی تھی۔

دو نسلوں کے درمیان رابطہ بحال ہو گیا تھا۔

جگنو کی روشنیاں سلامت تھیں اور گڑیا بھی زندہ تھی۔

عرشہ کی برسوں کی تھکن ختم ہو گئی تھی۔

تقاضے دلوں کے

نبیلہ ابر راجا

نور نے اسد کو دوا کھلا کر تکیہ سیدھا کر کے بیڈ پر دوبارہ لٹا دیا تھا۔ اس دوران موجود شہر یار بڑی گہری نگاہوں سے اس کا مسلسل جائزہ لے رہا تھا۔ نور سب کچھ محسوس کر رہی تھی... پر جان کر انجان بن رہی تھی، اسد کو لٹا کے وہ خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ شہر یار اسد سے باتیں کر رہا تھا اور نور، اسد کو بغور دیکھے گئی۔ ہر دم مسکراتی آنکھیں کب کی بجھ چکی تھیں۔ اس کے وجیہہ چہرے کی رونق بیماری نے ماند کر دی تھی۔ دس سال سے وہ اسی کیفیت میں تھا اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

اسد کو نیند آنے لگی تو شہر یار جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے چھوڑنے کے لیے باہر تک آئی کہ گیٹ بھی اسے ہی بند کرنا تھا۔ یہ اس کی ذمے داری اور

فرائض میں شامل تھا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی شہر یار کے قدم سست پڑ گئے۔ باہر آسمان پر بادل ڈول رہے تھے...... کسی بھی لمحے بارش ہو سکتی تھی...... شہر یار رک گیا۔ اس سے دو قدم پیچھے نور تھی' وہ مڑا۔ نور اس کے سامنے تھی۔ باہر برآمدے میں ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ نور کا سراپا واضح ہو رہا تھا۔ وہ آسمان سے اتری کوئی اپسرا نہیں تھی، حسینۂ عالم بھی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود... شہر یار کا دل اسے پانے کے لیے مچلتا تھا، ہمکتا تھا۔ وہ صرف اسے دیکھنے کے لیے روز یہاں آتا تھا...... حالانکہ اسے معلوم تھا کہ سماجی اور مذہبی حوالے سے یہ سب ٹھیک نہیں تھا۔۔ پر اس کا دل سب دلیلیں رد کر چکا تھا۔ اس کے دل سے ایک ہی آواز آتی نور، نور، نور۔

ٹیوب لائٹ کی روشنی میں وہ قدرے پُر اسرار نظر آ رہی تھی۔ براؤن اور بلیک کلر کا دوپٹا سلیقے سے اس کے کندھوں پر پڑا تھا...... دائیں رخسار پر پڑے بال، وقفے وقفے سے اُڑ رہے تھے اور نچلے ہونٹ کا تِل بے اختیاری پہ مجبور کر رہا تھا...... اچانک وہ واپس مڑی اب اس کی پشت شہر یار کی جانب تھی اس کی کمر کا خم ہمیشہ سے ہی اسے قابلِ توجہ لگتا تھا۔

''چابی اندر رہ گئی ہے، میں لے کر آتی ہوں، تم چلو بارش ہونے والی ہے۔'' وہ یہ کہہ کر وہیں سے اندر چابی لینے چلی گئی۔ شہر یار مسمرائز تھا...... روز کی طرح۔ اسے یوں لگتا تھا ایک دن وہ اسے دھکے دے کر نکال دے گی مگر وہ لاعلم تھا کہ وہ دن آن پہنچا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ آتی دکھائی دی۔ چابی اس کی لانبی نازک انگلیوں میں دبی تھی۔

''سنو، میں آج رات اِدھر ہی رک جاؤں؟''
شہر یار کے دل کی خواہش التجا بن کے لبوں پر آ گئی۔

''تم یہاں رک کر کیا کرو گے؟ جاؤ خالہ انتظار کر رہی ہوں گی۔'' نور نے ہنس کے اس کے ارمانوں پر بے حسی کی تیز دھار چھری چلائی۔

''موسم بہت خوب صورت ہے۔''

''تو......؟'' نور نے تیکھی نگاہوں سے اسے گھورا۔

''تمہیں بادلوں کے گرجنے سے ڈر جو لگتا ہے۔ آسمان کا رنگ دیکھو، لگتا ہے بہت تیز بارش ہو گی آج اور طوفان بھی آئے گا۔ تم تو ڈر ڈر کے ہی مر جاؤ گی۔ مجھے آج کی رات اِدھر ہی رکنے دو۔'' وہ ان لمحوں میں مجسم التجا بنا کھڑا تھا۔

''میرے پاس اسد ہیں ناں پھر کاہے کا ڈر......؟''
نور نے اس کی التجا اس کے منہ پر دے ماری۔

''اسد...... ہاہاہا...... وہ فالج کا مریض جو دس سال سے بستر پر پڑا خود تمہارے سہارے کا محتاج ہے...... وہ کیسے تمہارا ڈر دور کرے گا؟ ارے تم نہ ہوتیں تو کیڑے پڑ چکے ہوتے اس کے جسم میں۔'' . . .
شہر یار کے لفظ لفظ میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔

''جب تک میں زندہ ہوں اسد کے جسم میں کیڑے نہیں پڑنے دوں گی۔'' نور بولی تو اس کے لہجے کی سختی اسے کپکپا گئی لیکن وہ ڈٹا رہا۔

''اسد کے ساتھ رہتے رہتے تمہارے جذبات بھی مفلوج ہو گئے ہیں۔ خود کو دیکھو نور کیا تھیں تم...... ان اکیلی راتوں میں تمہیں کسی مضبوط سہارے کی طلب نہیں ہوتی۔ میری نظر میں تم آج بھی پہلے کی طرح خوب صورت ہو، میری بات مان جاؤ۔'' شہر یار کو محسوس ہو رہا تھا کہ آج وہ اسے موم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

''تم یہاں سے دفع ہو جاؤ، لعنت ہے تمہاری گھٹیا سوچ پر......'' وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔

''تم بہت پچھتاؤ گی، یہ لمحہ گزر گیا تو...... میں محبت کرتا ہوں تم سے...... عشق ہے تمہاری ذات سے مجھے، اس لیے تو اب تک شادی نہیں کی۔ اماں کہہ کہہ کے تھک گئیں مگر مجھے تمہارے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ میں اس امید پہ وقت گزارتا ہوں کہ ایک دن تم میری ہو جاؤ گی... کیوں خود کو رول رہی ہو، دس سال گزر چکے ہیں، کیا تم عورت نہیں ہو؟ تمہارے کوئی جذبات نہیں؟ کیا ملا ہے تمہیں اس زندگی سے...... بولو جواب دو۔''

وہ آج اس کے وجود میں دراڑیں ڈالنے پر تُلا ہوا تھا۔

''تم کوئی بوڑھی نہیں ہو، صرف پینتیس سال کی ہو، بہار اپنے جوبن پہ ہے نور...... وقت کی آواز سنو، تم اسد سے الگ نہیں ہونا چاہتی نہ ہو مگر اپنے ساتھ ظلم تو مت کرو، کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ......''

''خاموش ہو جاؤ شہر یار...... بہت بکواس کر لی ہے تم نے اب جاؤ......'' وہ ابھی مزید کچھ کہتا کہ نور اچانک ہوش میں آئی۔ نور کے تیوروں سے صاف لگ رہا تھا کہ اب وہ مزید رکا تو وہ اسے دھکے دے کر نکال دے گی۔

''میری آفر برقرار ہے، تم اسد سے الگ نہیں ہونا چاہتیں تو مت ہو، میں روز رات کو یہاں آ جایا کروں گا، کسی کو علم بھی نہیں ہو گا۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے...... آئندہ قدم مت رکھنا یہاں......'' نور نے سچ مچ اسے دھکا دیا۔

شہر یار گیٹ سے نکل کر باہر گلی میں جا کھڑا ہوا مگر وہ اب بھی کسی امید میں تھا۔ اسے سو فی صد یقین تھا کہ نور اندر سے کمزور پڑ گئی ہے، اس کے صبر پہ ضرب پڑ گئی ہے۔ وہ کسی بھی لمحے ہار مان لے گی اور اس کے من کی مراد پوری ہو جائے گی۔ وہ روز اسی آس پر اس کو کمپنی دینے کے لیے یہاں آتا تھا۔

☆☆☆

اسد اس کا کزن تھا۔ پندرہ سال پہلے اس کی شادی نور سے ہوئی تھی۔ شہر یار کا شروع سے ان کے گھر آنا جانا تھا۔ شادی کے پہلے سال ہی نور جڑواں بچوں کی ماں بن گئی۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی۔ جب اسد کو اچانک اسٹروک ہوا اور وہ آدھے دھڑ سے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ پھر تو مشکلوں نے گویا راستہ دیکھ لیا۔ نور عملی معنوں میں صرف گھر اور اسد کی ہو کے رہ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ شہر یار کو پہلے نور سے ہمدردی ہوئی اور پھر محبت...... وہ ہر صورت اسے پانا چاہتا تھا لیکن وہ اس کی رسائی سے دور تھی۔

نور گیٹ بند کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو مگر چہرے پر شدید غصہ تھا۔ کھٹاک کی آواز کے ساتھ لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ تب شہر یار آگے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس عورت کو نہیں جیت سکتا تھا۔ اسے ابھی ابھی ادراک ہوا تھا۔

''یہ مشرقی عورت بھی ناں...... کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی مرد کے گرد گھومتی ہے۔'' چلتے چلتے.. شہر یار کے قدموں تلے ایک پتھر آ گیا۔ اس نے زیرِ لب نور کو ایک گالی دی اور آگے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا کہ اب اس راستے پر پلٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

☆☆☆

شام ڈھلے گھر میں داخل ہوتے ہی احتشام کا پارا ہائی ہو گیا۔ حنان اور منان دونوں بھائی لڑ رہے تھے جبکہ گڑیا پاس بیٹھی ہر چیز سے بے نیاز ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ہر چیز بکھری ہوئی تھی۔ حالانکہ احتشام نے گھر میں تین، تین ملازم رکھ چھوڑے تھے۔ ایک لڑکا جو اوپر کے کاموں کے لیے مخصوص تھا بوقتِ ضرورت وہ ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا۔ اس کے علاوہ ایک پختہ عمر کی عورت ساجدہ تھی جو اس کی شریکِ حیات کی دیکھ بھال پر مامور تھی پھر ایک میڈ نسرین جو سارے گھر کے کام کاج کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی دیکھتی تھی۔ نسرین، ساجدہ کی بیٹی تھی دونوں ساڑھے چار سال سے اِدھر ہی تھیں۔ اب تو ان کی حیثیت گھر کے فرد جیسی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

احتشام کی شریکِ حیات سمیرا پانچ سال قبل تک بالکل صحت مند اور نارمل زندگی گزار رہی تھی۔ دو بیٹے، ایک بیٹی، خوب صورت پُر آسائش گھر، چاہنے والا شوہر...... اس کی زندگی ہر لحاظ سے خوشگوار اور مکمل تھی۔ ایک اتفاقی حادثے نے اس کی زندگی کی سب خوشیاں اس سے چھین لیں۔

سمیرا ڈرائیور کے ساتھ میکے سے گھر واپس آ رہی تھی جب ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ ڈرائیور کو بھی

چوٹیں آئی تھیں لیکن کافی علاج معالجے کے بعد وہ بالکل پہلے کی طرح صحت منداور ہشاش بشاش ہوگیا تھا۔اس نے سیٹ بیلٹ بھی باندھ رکھی تھی مگر بدقسمت سمیرا کواس حادثے نے بالکل بستر کا کردیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ وہ کلی طور پر دوسروں کے سہارے اور مدد کی محتاج تھی۔ اچھی خاصی زندگی کو جانے کس کی نظر لگی تھی جو وہ معذوری جیسی زندگی گزارنے پرآ گئی تھی۔

احتشام نے اپنی طرف سے ہرممکن طور پراس کا علاج کروانے اور صحت مند زندگی کی طرف واپس لانے کی پوری پوری کوشش کی لیکن اوپر والے نے جو تقدیر میں لکھنا تھا وہ تو لکھ ڈالا تھا۔ احتشام نے اپنے تعلقات استعمال میں لاتے ہوئے بیرونِ ملک کے ڈاکٹرز سے بھی سمیرا کا کیس ڈسکس کیا، اس کی سب رپورٹس بھیجیں لیکن کسی نے امید افزا جواب نہیں دیا۔ سمیرا کواب باقی زندگی بستر پر لیٹ کرہی گزارنی تھی اور وہ پچھلے پانچ سال سے ویسی زندگی گزار رہی تھی۔

☆☆☆

شروع کا کچھ عرصہ سمیرا کے میکے اور سسرال والوں نے اس کی دیکھ بھال کی لیکن یہ مستقل ذمّے داری تھی اور ہرایک کی اپنی اپنی ذمّے داریاں تھیں، اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ آہستہ آہستہ سب پیچھے ہٹ گئے۔ احتشام کوسمیرا سے بے پناہ محبت تھی اس نے ہر ممکن طور پر اس کا خیال رکھنے اور دلجوئی کی کوشش کی...... پھر یہ دلجوئی آہستہ آہستہ بیزاری اور جھنجلاہٹ میں ڈھلتی گئی۔ وقت گزر رہا تھا اگرچہ احتشام نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک عورت کو مامور کردیا تھا اور گھر کے کاموں کے لیے بھی ایک عورت الگ تھی مگر احتشام کی بھی تو اپنی کچھ ضروریات اور جذباتی تقاضے تھے جن کا پورا کرنا سمیرا کے بس میں اب نہیں رہا تھا۔

احتشام پہلے اپنے بیڈروم میں ہی سوتا تھا جواُن دونوں کا مشترکہ تھا۔ کچھ عرصے بعد جب رات میں بھی اٹینڈنٹ کی ضرورت پڑی تو اس نے اپنے سونے کا کمرا الگ کرلیا۔ سمیرا اب بیڈ پر اکیلے سوتی تھی اور نیچے میٹرس بچھا کر ساجدہ سوتی تھی۔

احتشام کھڑے کھڑے آکر اس کی خیریت پوچھنے اور اپنی شکل دکھانے کا فرض ادا کرتا۔ آہستہ آہستہ اس کے استعمال کی چیزیں بھی یہاں سے منتقل ہوگئی تھیں اب اس کی باتوں اور تاثرات سے بیزاری وبیگانگی اور جھنجلاہٹ ٹپکتی، وہ پہلے والی محبت جانے کہاں جا سوئی تھی جس کے راگ الاپتے وہ تھکتا نہیں تھا۔

سمیرا سب خوب سمجھ رہی تھی اور اب اس نے اپنی مستقل بیماری سے سمجھوتا کرلیا تھا لیکن اس کے باوجود احتشام کودوسری شادی کا مشورہ دیتے اور اپنے اندر کی عورت کو مرتے دیکھ کروہ بہت روئی۔

احتشام نے اس کے مشورے پر کسی خاص تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ سمیرا کی اس حالت کے بعد اسے باہر کے رنگ، رنگ کے کھانے کی عادت پڑگئی تھی، ایسے میں سمیرا کی طرف سے دوسری شادی کا مشورہ ایسے ہی تھا جیسے کہ نت نئے کھانے کا ذائقہ چکھنے سے محروم رہ جانا اور ایک ہی کھانے پر اکتفا کرنا......سو اس نے بڑی سہولت سے انکار کرتے ہوئے اپنے... باوفا شوہر ہونے کے امیج کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ سمیرا کے سر سے بھی تلوار ہٹ گئی تھی جس کی دھار اور چمک احتشام کودوسری شادی کا مشورہ دیتے ہوئے اس نے محسوس کی تھی۔

☆☆☆

''پپا آپ آگئے......؟'' حنان نے بھائی سے لڑنا موقوف کرکے احتشام کی طرف رخ کیا جو اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں آگیا ہوں پھر سے اس دوزخ میں سڑنے کے لیے جہاں میرے لیے ذرا بھی سکون نہیں۔'' وہ بچوں پر غصہ کرکے سیڑھیاں چڑھ کرسیدھا اپنے کمرے میں آگیا۔

حنان اور منان اب شرافت سے بیٹھے تھے......

اندر کمرے میں لیٹی سمیرا نے احتشام کی زبان سے نکلا ایک،ایک لفظ سنا تھا۔ساجدہ سے چہرہ چھپا کے اس نے اپنے بہتے آنسو صاف کیے۔ باہر زور شور سے بادل گرج رہے تھے جو بارش کی آمد کا اعلان تھا۔ بادل گرجتے ساتھ ہی لائٹ چلی گئی کمرا اچانک گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا تو سمیرا کو کھل کے رونے کا موقع مل گیا۔اسے اب ساجدہ سے چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

''نسرین میرے یہ کپڑے فوراً استری کردو اور ساتھ فٹافٹ شوز بھی پالش کردو۔ مجھے ایک دوست کی طرف جانا ہے۔'' لائٹ آگئی تھی اور احتشام،نسرین کے سر پر ایک بہت عمدہ شرٹ اور پینٹ لیے کھڑا تھا۔وہ کچن کے کام نمٹا رہی تھی اس کے حکم کی تعمیل میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کپڑے استری کرنے چل پڑی۔

کپڑے استری کرنے شوز پالش کرنے کے بعد جب تک احتشام کی اچھی طرح تسلی نہیں ہوگئی، اس نے تین بار جوتوں پر کپڑا پھیرا تب کہیں جا کر وہ مطمئن ہوا۔

نسرین پھر سے کچن میں آکر اپنے کاموں میں لگ گئی۔اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

☆☆☆

نک سک سے تیار ہونے کے بعد خود کو خوشبوؤں میں بسا کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو موسم کی رنگینی اپنے عروج پر تھی۔ رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی، آسمان سے شبنمی موتی بارش کی صورت ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے تھے۔

وہ عادتاً بچوں کے کمرے کی طرف آیا۔ حنان، منان اور گڑیا تینوں سو رہے تھے۔اس نے مطمئن ہوکر بیڈروم کا دروازہ بند کیا اور سمیرا کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بے حس وحرکت لیٹی ہوئی تھی۔ ساجدہ کمرے میں نہیں تھی۔

''اچھا ،میں ایک دوست کی طرف جارہا ہوں۔'' احتشام نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھتے ہوئے رسمی سے انداز میں اسے مطلع کیا تو سمیرا کی ساری جان آنکھوں میں سمٹ آئی۔ ہفتے میں تین دن اسی طرح بن سنور کر وہ اپنے دوست کی طرف لازمی جاتا تھا۔سمیرا نے بے جان سے انداز میں اثبات میں سرہلایا،یہ اس کی طرف سے خاموش سمجھوتا تھا۔

احتشام نے مزید کوئی بات نہیں کی اور واپس پلٹ گیا۔ باہر برآمدے میں آکر اس نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں رم جھم،رم جھم برسات جاری تھی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔سخت سردی تھی لیکن اس کے اندر کا موسم حرارت سے پُر تھا۔اس نے ہاتھ میں دبی گاڑی کی چابی کو دیکھا۔

''ہائے معذور عورت میری زندگی کے کتنے قیمتی سال ضائع ہورہے ہیں صرف اس کی وجہ سے...... میں اپنی ذاتی خوشی کے لیے ترس گیا ہوں...... بلائے جان کی طرح میرے سر پر مسلط ہے ،گھر میں ذرا سکون نہیں ہے۔داخل ہوتے ہی اس کی منحوس صورت دیکھنے کو ملتی ہے......میں ایسے میں کسی دوست کی طرف نہ جاؤں تو کیا کروں......آخر خوشیوں پر میرا بھی تو حق ہے......'' احتشام گاڑی کی چابی کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سمیرا سے مخاطب تھا۔شاید وہ اپنے آپ کو ان خوشیوں کا شدید حقدار سمجھ رہا تھا۔

''منحوس صورت عورت ...... اس سے میری جان کبھی نہیں چھوٹے گی۔'' گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں ایک بار پھر سمیرا کو موٹی سی گالی دی۔

گاڑی گیٹ سے نکل کر اب سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔وہ اپنی دوست کی طرف جارہا تھا۔نفسانی اور جذباتی تقاضے بھی تو پورے کرنے تھے آخر کو وہ ایک مرد تھا۔مشرقی مرد!

☹

یہ کیسی عید
نبیلہ ابر راجہ

منی بہت خوش تھی امی ابو نے پورے سو سو روپے عیدی دی تھی، منی کے اور بہن بھائیوں کو اس سے کم عیدی ملی تھی، منی گھر بھر کی لاڈلی تھی، بہت پیاری بھولی اور دل موہ لینے والی باتیں کرتی تھی اسی وجہ سے امی ابو اسے دوسرے بہن بھائیوں سے زیادہ پیار کرتے تھے، منی کا اصل نام تو حنا تھا مگر کوئی بھی اصل نام سے پکارتا نہیں تھا سب لاڈ میں منی ہی بلاتے تھے، خود منی بھی سب کو اپنا نام حنا بتانے کے بجائے منی ہی بتاتی تھی۔

وہ نو سال کی تھی مگر دیکھنے میں کم سے کم اپنی عمر سے دو ڈھائی سال بڑی نظر آتی تھی، اچھی خوراک ماں باپ کی بھرپور محبت نے اسے پھول جیسی تازگی اور شگفتگی عطا کی تھی۔

نہ جانے منی کی شخصیت میں ایسا کون سا جادو تھا کہ گھر تو گھر محلے والے بھی اسے بہت پیار کرتے تھے۔

منی کے ابو سعودیہ میں ہوتے تھے، سال بعد ایک ماہ کی چھٹی پہ پاکستان آتے تو منی کے لیے کھلونے، کپڑے، ویڈیو گیمز، گڑیا، شیمپوز اور جانے کیا کیا کچھ اٹھا لے آتے، وہ منی کو اپنی جان کہتے تھے، ایک بار منی کو بخار ہو گیا، وہ سعودیہ میں تھے، بیوی نے ایسے ہی فون پہ باتوں باتوں میں منی کی طبیعت کا بتایا تو وہ سخت بے چین ہو گئے، کسی نہ کسی طرح کفیل سے لڑ جھگڑ کر زبردستی پاسپورٹ لے کر پاکستان آ گئے۔

آگے منی کھیل کود رہی تھی، وہ اسے لپٹا کے رو پڑے، منی تب کافی چھوٹی تھی اسے ابو کے آنسوؤں کی سمجھ نہیں آئی، لیکن جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی اسے ابو کی محبت کا خوب اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا، وہ سوچ کر ہی مغرور ہو جاتی کہ امی ابو اسے کتنا پیار کرتے ہیں، اس پیار کا اس نے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی، وہ ضدی اور بدتمیز بھی نہیں تھی؛ بلکہ بہت سمجھدار تھی، تب ہی تو امی ابو نے آج جب سو سو روپے عیدی دی تو اس نے سو روپے اپنے بستے میں رکھ دیے کہ سکول جا کر مزے مزے کی چیزیں کھائے گی، عید پہ خرچ کرنے کے لئے سو روپیہ کافی تھا۔

امی نے اس کے لئے گوٹے والے بہت خوبصورت کپڑے بنوائے تھے، ساتھ ایڑی والی سنہری جوتی تھی، بجی بنی منی بہت خوبصورت لگ رہی تھی، امی نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری تھی۔

ابو عید کی نماز پڑھ کر آئے تو دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی، امی بھی مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف تھی، منی انہیں حوالدار چاچا کی دکان پہ جانے کا بتا کر اچھلتی کودتی باہر نکل گئی۔

منی کے گھر سے باہر پاس ہی آٹھ دس دکانیں تھیں، جہاں بچوں کی دلچسپی کی بہت سی چیزیں بھی ہوتی ان کا دل للچا رہی تھیں۔

منی حوالدار چاچا کی دکان سے کھانے پینے کی چیزیں لیتی تھی، ان کی دکان آٹھ دس دکانوں والی لائن میں نہیں تھی بلکہ ذرا ہٹ کے ان دکانوں سے پہلے آتی تھی، حوالدار چاچا کی دکان اور باقی دکانوں کے درمیان ایک خالی پلاٹ تھا جہاں کافی جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا، حوالدار چاچا آرمی سے ریٹائرڈ ہوئے تھے، نوکری سے فراغت کے بعد انہوں نے دکان کھول لی، خدا نے آہستہ آہستہ برکت بھی دے دی، انہوں نے تقریباً ہر قسم کا سامان دکان میں ڈالا ہوا تھا، سفید داڑھی اور بے ضرر شخصیت کے ساتھ حوالدار چاچا آس پاس کے دکانداروں اور لوگوں میں کافی مقبول تھے، اب تو ہر کوئی حوالدار چاچا ہی کہتا تھا۔

منی سو روپیہ پکڑے خراماں خراماں حوالدار چاچا کی دکان کی طرف رواں دواں تھی، خالی پلاٹ کے قریب بڑی خاموشی تھی، اتفاق سے اس وقت منی کے سوا اور کوئی ذی نفس یہاں موجود نہیں تھا، حالانکہ عید کا دن تھا پھر بھی خاموشی تھی، منی پلاٹ کی پشت سے گھوم کر حوالدار چاچا کی دکان کی طرف جا رہی تھی، پکی سڑک پہ کالے رنگ کی گاڑی کھڑی تھی، وہ اپنے خیالوں میں مگن سرمست ادھر ادھر دیکھے بغیر مزے سے آگے بڑھ رہی تھی۔

دو گھنٹے گزر چکے تھے منی ابھی تک حوالدار چاچا کی دکان سے نہیں لوٹی تھی اس کی امی مہمانوں کو کھانا دے کر فارغ بھی ہو چکی تھی، کھانے کے بعد اس نے چائے بنائی اور سب کو دی، برتن دھو کر اب اسے فراغت نصیب ہوئی تو منی کا خیال آیا، گھڑی پہ نظر پڑی تو گزرتے وقت کا احساس ہوا، شام کے چار بج چکے تھے، اس کا دل ہول سا گیا، وہ دوپہر کے کھانے سے پہلے گھر سے نکلی تھی، اتنی دیر وہ کبھی گھر سے باہر رہی نہیں تھی، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ امی اس کی زیادہ دیر کی غیر موجودگی سے پریشان ہو جاتی ہیں۔

''ارے ذیشان جاؤ دیکھو منی کہاں ہے باہر کہیں کھیل رہی ہوئی تو بلا کے لے آؤ، کافی ٹائم ہو گیا ہے۔'' ذیشان ماں کے لہجے میں چھپی پریشانی محسوس نہ کر سکا، پانچ منٹ بعد وہ گھر واپس آ گیا۔

''امی منی باہر نہیں ہے میں جھولے والے کے پاس بھی دیکھ آیا ہوں اُدھر بھی نہیں ہے۔'' اس نے اطلاع دی تو امی کا دل انجان خدشات سے لرزنے لگا، انہوں نے اسی وقت اپنے شوہر کو اٹھایا جو دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کر رہے تھے، وہ بھی اس اچانک افتاد سے پریشان ہو گئے۔

''ارے منی کے ابو انھیں، اتنی دیر ہو گئی ہے منی گھر واپس نہیں آئی ہے، وہ حوالدار چاچا کی دکان پہ جانے کا کہہ کر گئی تھی، اتنی دیر میں اسے واپس آ جانا چاہیے تھا، ذیشان بھی باہر جھولوں کی طرف دیکھ آیا ہے وہ اُدھر بھی نہیں ہے۔'' منی کی امی روہانسی ہو رہی تھی۔

منی کے ابو اسی وقت منی کا پتہ کرنے چلے گئے، منی کی امی آس پڑوس کے گھروں سے پوچھنے گئی کہ منی ادھر تو نہیں آئی، کبھی کبھی وہ اپنی ہم عمر شازیہ اور فری کے گھر چلی جاتی تھی، مگر وہ ان میں سے کسی کے گھر نہیں تھی، اس نے پچھواڑے گھروں سے بھی پتہ کیا پر ہر جگہ مایوسی ہوئی۔

اُدھر منی کے ابو حوالدار چاچا کی دکان پہ گئے وہاں جا کر انہیں ناقابل بیان حیرت ہوئی جب حوالدار چاچا نے کہا کہ منی آج ان کی دکان پہ آئی ہی نہیں، وہ بے چارے خود پریشان ہو گئے کہ منی اتنی دیر سے غائب ہے وہ بھولی بھالی معصوم سی بچی خود انہیں بھی بہت اچھی لگتی تھی۔

جس جس کو پتہ چل رہا تھا وہ منی کے گھر آ رہا تھا، کچھ لوگ منی کے ابو کے ساتھ مل کر منی کو تلاش کر رہے تھے، دن ڈھل گیا رات سر پہ آ گئی پر منی کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا، منی کی امی کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے، اس کے ابو کا بھی یہی حال تھا، سارے محلے اور ادھر اُدھر سے معلوم کروایا جا چکا تھا پر ان کی منی کہیں نہیں تھی، منی کے ابو کے ایک دوست نے پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا مشورہ دیا، جو منی کے ابو کو مناسب لگا۔

رات بھی قطرہ قطرہ ڈھل رہی تھی، ان کے گھر کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا کہ شاید منی لوٹ آئے، انہیں تو عید کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا، کیسی ماتمی عید ان کے گھر آئی تھی کہ ہر سو ویرانی کا احساس ہو رہا تھا، منی کے امی

نے کچھ نہیں کھایا تھا، دونوں نے وہ رات آنکھوں میں کاٹ دی، صبح ہوتے ہی منی کے ابو اپنے دوست کے ساتھ پولیس اسٹیشن چلے گئے، انہوں نے منی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا دی تھی، ساتھ ہی اتوار کے اخبار میں منی کی گمشدگی کا اشتہار بھی دے دیا گیا۔

پولیس آئی اور سب سے پہلے حوالدار چاچا سے پوچھ گچھ کی، شک کی بنا پر انہیں حراست میں لے لیا گیا اور سخت کڑی تفتیش کی گئی، پر وہ بے گناہ ثابت ہوئے، اس کے بعد اردگرد کے باقی دکانداروں سے پوچھا گیا، مگر سب کا ایک ہی جواب تھا کہ عید کے دن منی ان کی دکان پہ نہیں آئی۔

دن پہ دن گزرتے جا رہے تھے منی کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا، پتہ نہیں اسے زمین کھا گئی تھی کہ آسمان، منی کے ابو کی چھٹی بھی ختم ہو گئی تھی، وہ ڈیڑھ ماہ لیٹ واپس سعودیہ گئے تھے، پیٹ کا دوزخ بھرنا بھی ضروری تھا، منی کی تلاش کے سلسلے میں پولیس نے پورے پورے تعاون کا یقین دلا کر ان سے بہت کچھ اینٹھ لیا تھا، اخبار میں انہوں نے گمشدگی کا جو اشتہار دیا تھا، اس کے بعد بھی کسی نے ان سے رابطہ نہیں کیا تھا، مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں بھی امید کی کرن نہیں تھی، منی کی امی کی حالت بہت خراب تھی، منی کی گمشدگی کو پورا ایک سال گزر گیا تھا، وہ روز اس کی واپسی کا انتظار کرتی، اس ایک سال کے دوران منی کے ابو نے دو بار پاکستان چکر لگایا کہ شاید منی کی تلاش میں کوئی پیش رفت ہوئی ہو، مگر وہ معاملہ اُدھر ہی رکا ہوا تھا ایک ایک کر کے یونہی نو سال گزر گئے تھے۔

منی کی پھپھو لاہور بیاہی ہوئی تھی، ان کے شوہر ہائی اسکول میں ٹیچر تھے پڑھانے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کے بھی بہت شوقین تھے، اسی شوق کی تکمیل کی خاطر انہوں نے گھر پہ دو تین اخبار لگوائے ہوئے تھے، کچھ رسائل جرائد ان اخبارات کے علاوہ بھی تھے۔

چھٹی کا دن تھا وہ برآمدے میں بیٹھے نومبر کی دھوپ میں اخبار بینی کا شوق پورا کر رہے تھے اندرونی صفحات میں ایک چھوٹی سی سرخی نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔

''یہ بچی کس کی ہے؟'' انہوں نے باقی خبر پڑھی اور خبر کے ساتھ تصویر بھی دیکھی پھر وہیں بیٹھے بیٹھے بیوی کو آواز دی، وہ باورچی خانے میں ناشتے کے برتن دھو رہی تھی، شوہر کی آواز میں اتنا ہیجان اور اضطراب تھا کہ وہ برتن چھوڑ کر آ گئی، انہوں نے اخبار بیوی کی طرف بڑھائی پڑھ کر اس کا بھی وہی حال ہوا۔

''ارے یہ تو اپنی منی لگ رہی ہے۔''

''ہاں مجھے بھی تفصیلات پڑھ کر ایسا ہی لگا کہ یہ منی ہے، فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے، کیوں نہ چل کر خود دیکھیں۔''

''نہیں نہیں میں بھابھی کو فون کرتی ہوں بھائی جان بھی آئے ہوئے ہیں ان کے ساتھ چلیں گے۔'' منی کی پھپھو نے اپنا پروگرام بتایا۔

ان کے شوہر ایک بار پھر وہ خبر پڑھنے لگے۔

''اٹھارہ سال کی جواں سال لڑکی جو اپنا نام منی بتاتی ہے اور قصبہ کوراں سے جس کا تعلق ہے اسے اپنے اور قصبے کا نام ہی معلوم ہے اس بچی کے وارث دیئے گئے نمبر پہ رابطہ کریں۔'' خبر کے ساتھ دھندلی بلیک اینڈ وائٹ تصویر بھی تھی، لیکن منی اور قصبہ کوراں کا نام چونکا دینے والا تھا۔

منی کی پھپھو نے پنڈی میں مقیم بھائی اور بھابھی کو فون کر کے اخبار میں چھپنے والی خبر اور

تصویر کے بارے میں بتا دیا تھا، وہ بذریعہ بس لاہور آ رہے تھے، رات تک وہ پہنچ چکے تھے، ان دونوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اخبار کے دیئے پتے پہ ابھی پہنچ جائیں، مگر رات ہو گئی تھی مناسب تھا کہ صبح ہی جایا جاتا، منی کے پھوپھا کافی معاملہ فہم انسان تھے، انہوں نے اخبار میں دیئے نمبر پہ فون کر کے سب پوچھ لیا تھا اور اپنے آنے کا بھی بتایا تھا۔

ایڈریس لاہور کے اپر مڈل کلاس علاقے کا تھا۔

منی کے امی ابو اور پھپھو، پھوپھا خوبصورتی سے سجے ڈرائننگ روم میں بیٹھے تھے، بارعب سا آدمی اور ادھیڑ عمر عورت جو یقیناً گھر کے مالکان میں تھے ان کے پاس بیٹھے منی نام کی لڑکی کے بارے میں بتا رہے تھے۔

انہیں اٹھارہ سال کی جواں سال لڑکی رات فقیر والی سے واپسی پہ بڑے ناگفتہ بہ حالت میں سڑک پہ چلتے ہوئے ملی تھی۔

دونوں خدا ترس اور رحمدل تھے، خود ان کی اپنی پانچ بیٹیاں تھیں جس طریقے سے وہ لڑکی سڑک پہ چلتے چلتے ان کی گاڑی کے سامنے آئی تھی وہ بڑا چونکا دینے والا تھا، یوں لگ رہا تھا لڑکی پورے طور پہ اپنے حواس میں نہیں ہے، شجاعت صاحب اور ان کی بیگم نے لڑکی کی حالت اور کچھ انسانی ہمدردی کے پیش نظر اسے گاڑی میں بٹھا لیا۔

گھر لا کر اس کی حالت دیکھ کر شجاعت صاحب کی بیگم رو پڑیں، لڑکی کے پورے جسم پہ نوچنے کھسوٹنے کے نشان موجود تھے، یہی حال اس کے چہرے کا بھی تھا، یوں محسوس ہو رہا تھا کہ لڑکی کو بہت سارے افراد نے مل کر جنسی تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔

یہ شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب انہوں نے ایک لیڈی ڈاکٹر سے لڑکی کا معائنہ کروایا، اس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ لڑکی کو کافی عرصہ سے ذہنی و جسمانی کے ساتھ ساتھ بہت سارے افراد مل کر جنسی تشدد کا بھی نشانہ بناتے رہے ہیں، اسی وجہ سے اس کی ذہنی حالت ابتر ہے، شجاعت صاحب نے لڑکی سے نام پوچھا اس نے منی بتایا اور گھر وغیرہ کا پوچھا تو اس نے کہا میرا گھر کورال میں ہے، انہوں نے اس حوالے سے اور سوال بھی کیے مگر وہ کچھ اور بتانے سے قاصر تھی، یوں لگتا تھا اس کے عمر کے ماہ و سال گم ہو گئے ہیں کیونکہ ہر سوال پہ وہ ٹکر ٹکر ان کا منہ دیکھنے لگتی تھی۔

دو باتیں ہی معلوم تھی پوچھنے پہ وہ رٹو طوطے کی طرح دہرا دیتی تھی اور بس، باقی اس کی حرکات نارمل لڑکیوں جیسی ہی تھی بس ہر وقت گم صم اور خاموش رہتی تھی، شجاعت صاحب نے منی سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اخبار میں اشتہار دیا جس کے نتیجے میں منی کے امی ابو اور پھوپھا پھپھو اس وقت شجاعت صاحب کے گھر موجود تھے۔

شجاعت صاحب اور ان کی بیگم نے جو کچھ بتایا تھا اسے سن کر منی کے امی ابو کی حالت غیر ہو رہی تھی، شجاعت صاحب نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو آواز دے کر منی کو ڈرائنگ روم میں لانے کے لئے کہا، منی کے امی ابو کی روح آنکھوں میں سمٹ آئی تھی منی نام کی لڑکی آ گئی تھی، منی کے امی ابو نے انکار میں سر ہلایا نہیں یہ ہماری بیٹی نہیں ہے، اس کے بعد وہ وہاں رکے نہیں۔

منی نامی لڑکی نے بھی خاص تاثر کا اظہار نہیں کیا کیونکہ ڈاکٹر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کی یادداشت کام نہیں کر رہی ہے، منی نامی لڑکی کو دیکھ کر اپنی بیٹی کی تلاش میں آنے والے میاں بیوی کے چہرے پہ جو رنگ اور تاثرات ابھرے تھے وہ شجاعت صاحب سے مخفی نہیں رہ سکے تھے۔

ان کے جانے کے بعد شجاعت صاحب یکا یک آزردہ نظر آنے لگے تھے۔

"ہماری آج سے پانچ نہیں بلکہ چھ بیٹیاں ہیں۔" انہوں نے اپنی بیگم سے تائید چاہی تھی، جواباً انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

منی کی امی دبی دبی سسکیوں سمیت رو رہی تھی، یہی حال اس کے ابو کے بھی تھا۔

"وہ ہماری منی ہی تھی ناں پھر کیوں کہا کہ وہ ہماری بیٹی نہیں ہے۔" منی کے ابو نے مجرموں کی طرح نظر چرا لی، منی کا نوچا کھسوٹا چہرہ ان کے سامنے آ گیا تو وہ انہوں نے بے اختیار جھرجھری لی، ان کی منی اپنی عزت گنوا چکی تھی لخت لخت وجود کو جانے کس کس نے روندا تھا، اس کی حالت خود اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کا احوال بتا رہی تھی، منی بچپن میں سائیکل سے گری تھی گرنے سے اس کے ماتھے پہ زخم آ گیا تھا جو بھرنے کے باوجود نشان چھوڑ گیا تھا، اٹھارہ سال منی میں نو سالہ منی کی شباہت صاف محسوس کی جا سکتی تھی، اس کے ماتھے پہ زخم کا نشان ابھی تک موجود تھا، وہی ناک نقشہ وہی رنگت وہی بال سب وہی تھا بس درمیان میں نو سال کی گمشدگی گزری تھی۔

"ہم اسے گھر لے آتے تو ہماری برادری والے ہمیں جیتے جی مار دیتے منی کی ماں۔" منی کے ابو پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی، بارش کی آواز میں ان دونوں میاں بیوی کی سسکیوں کی آواز معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆